افلاطون
حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ
ڈاکٹر شاہد مختار

افلاطون

حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ

ڈاکٹر شاہد مختار

شاہد پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوبرجی سنٹر ملتان روڈ لاہور فون: ۷۳۱۹۹۶۳

زندہ کتاب کی علامت
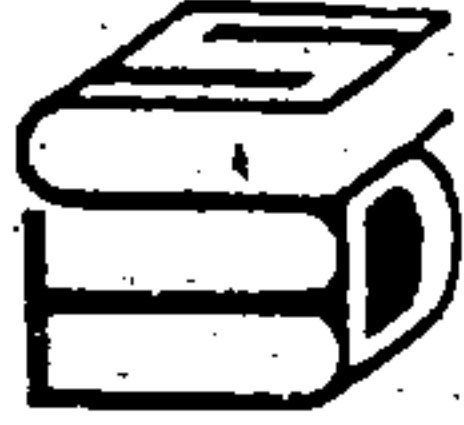
کتاب	افلاطون
مصنف	شاھد مختار
ناشر	خالد مختار ' شاھد پبلشرز چوبرجی سنٹر
کمپوزنگ	محمد جاوید ' خالد کمپوزنگ سنٹر
فون نمبر	7419963
ٹائٹل	احسان صدیقی
مطبع	شریف پرنٹرز لاہور
قیمت	180 روپے

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر

اپنی ذات میں کائنات

"مصطفیٰ وحید کے نام"

جنکی" نگارشات" ادبی دنیا کا ایک حصہ ہیں

تجھ سے بچھڑ کر ایک پل راحت نہیں ملی

میں کائنات نام دوں یا دل کہوں تجھے

شاھد مختار

عرض ناشر

اس ادارہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ اُن شخصیات پر کام کر رہا ہے جن کے محققانہ نظریات و تصورات مختلف حوالوں سے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ قبل ازیں "سقراط" اور "ارسطو" جیسے عظیم مفکرین کے فلسفیانہ نظریات کو یکجا کر کے پیش کیا جا چکا ہے جبکہ زیرِ نظر کتاب عظیم فلسفی اور نثر نگار افلاطون کے بارے میں ہے جسے آگسٹائن نے فلاسفہ کا مسیحا کہا اور غزالی اُسے "الہیون" میں شمار کرتے ہیں۔ بلاشبہ اُس کے فلسفہ میں اشراق' سریت' مذہب' باطنیت اور عقلیت پسندی کے عناصر شامل ہیں۔ اس نے فیثا غورث' پا رمی نائڈس' ہیر یکلیتیس اور سقراط کے نظریات و تصورات سے فیض یاب ہوتے ہوئے عالم کے فریب نظر ہونے' حیات و موت' ارواح کی بقا' تنسخِ ارواح اور عالمِ مثال کے ازلی اور سکونی ہونے کے تصورات سے دنیا کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی خوبصورتی دراصل حسن ازل کا پرتو ہے حسن ازل کے اس افلاطونی تصور کو بعد میں سریت پسندوں اور صوفیوں نے اپناتے ہوئے اسے عشقِ حقیقی کا نام دیا۔

متذکرہ تینوں کتب پاکستان کے نامور ادیب شاہد مختار کی تصنیف کردہ ہیں جن کا اسلوبِ بیان اور طرزِ تحریر قاری کو مجبور رکھتا ہے کہ وہ کتاب کے خاتمہ تک اپنی نظر کتاب پر جمائے رکھے چاہے وہ کتاب فلسفہ سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

خالد مختار

ابتدائیہ

یونان کی پرانی تاریخ چار ادوار پر مشتمل ہے۔ اولین دور 800ق م سے 480ق م تک پھیلا ہوا ہے جو مبہم اور غیر واضح ہے۔ اس دور کو یونانی مینوان (Mianoan) اور مائی سی نین (Mycenaen) دور کہتے ہیں۔ دوسرا دور 480ق م سے 400ق م پر محیط ہے جسے ہومری زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس دور کا ماخذ ہومر کی دو رزمیہ نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسی ہیں جو صدیوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ تیسرا دور 400ق م سے 300ق م پر محیط ہے جو یونانی شہروں اور ریاستوں کی باہمی مخاصمت اور ریشہ دوانیوں سے بھرپور ہے جبکہ چوتھا دور جسے ہیلینی دور بھی کہا جاتا ہے 300ق م سے 50ق م تک پھیلا ہوا ہے اور یہ دور یونانیوں کے زوال و انتشار کا دور ہے جس میں رومیوں نے یونانیوں پر غلبہ حاصل کیا۔

تاریخ یونان کے دوسرے دور میں یونان کے مشہور شہر ایتھنز میں 427ق م میں ایک ایسا عظیم فلسفی اور نثر نگار پیدا ہوا جس نے سوفسطائی نظریات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے دنیا کو ایک ایسا ضابطہ اخلاق دیا جو ہر جگہ اور ہر وقت قابل عمل ہے۔ اس نے یونان کے استحکام کے لیے ایک ایسا سیاسی نظام پیش کیا جو بالآخر متزلزل سیاسی حالات اور مختلف طرز ہائے حکومت کے خاتمے کا باعث بنا۔ اس کے دیئے گئے سیاسی نظام کی اساس کو نہ صرف یونان نے اپنایا بلکہ انقلاب فرانس کے بعد تمام مغربی ممالک بھی اس کے فلسفہ

سیاست سے مستفید ہوئے اور آج بھی مغربی دنیا میں اس کے فلسفہ سیاست کے بہت سارے اصول کار فرما ہیں۔

اس عظیم مفکر نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مملکت کا اخلاقی مقصد متعین کرتے ہوئے کہا کہ "مملکت کا ایک اخلاقی وجود ہے جس کے لازمی اجزا افراد ہیں جن کی اخلاقی نشوونما صرف مملکت کے مستحکم سیاسی نظام کی بدولت ممکن ہے" اس نے دنیا میں پہلی بار ایک ایسا نظام فکر پیش کرنے کی کوشش کی جو کائنات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً اخلاقیات' علمیات' طبعیات اور سیاسیات وغیرہ کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے اس نے نظریہ علم' نظریہ امثال' نظریہ ریاست' نظریہ موجودات' نظریہ بقائے اخلاق اور نظریہ ریاست پیش کر کے نہ صرف فلسفہ یونان کے کینوس کو وسیع کیا بلکہ نئے علوم اور نئی تحقیقات کے ذریعے انسان کو انفرادی زندگی گزارنے اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔

اس کے نزدیک سچا علم وہی ہے جو حکمتی تصورات پر مبنی ہو اور سچا فلسفی وہی ہے جو اپنے افکار سے کردار انسانی کے لئے بصیرت مہیا کرے۔ اس کے نزدیک چیزیں اس لئے نیک یا صالح نہیں کہ خدا انہیں مرغوب سمجھتا ہے بلکہ خدا صرف ان چیزوں کو مرغوب رکھتا ہے جو نیک یا صالح ہیں۔

اس عظیم فلسفی کا نام افلاطون ہے جس نے منطقی بازی گری کا گر سقراط سے سیکھا تھا وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ میں نسلاً یونانی ہوں' وحشی نہیں۔ حر ہوں' غلام نہیں۔ مرد ہوں' عورت نہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مقام شکر یہ ہے کہ سقراط کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں۔"

اس عظیم فلسفی نے عدل کو ایک اعلیٰ ترین نیکی کا درجہ دیتے ہوئے کہا کہ عدل روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے عدل کل کا جوہر اور تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد کا تعین کرے'

مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت وجرات سے ریاست کی حفاظت کرے اور دولت مند گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے مطابق چلائے۔ اس کے نزدیک فلسفی ہی نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں جبکہ جمہوریت مستقل کشمکش، فتنہ وفساد، محض دھوکہ اور فریب ہے۔ اور عام لوگوں کو حقیقت یا علم کا درجہ دینا جہالت ہے۔ خدا نے فلسفیوں اور محافظوں کو سونے سے، سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے لہٰذا نچلے طبقے پر لازم ہے کہ وہ دونوں برتر طبقوں کی جو انسانیت کے بہترین عناصر ہیں کی پوری اطاعت کرے۔

آیئے! اس عظیم فلسفی کے حالات و واقعات اور اس کے پیش کردہ نظریات سے مستفید ہوتے ہیں۔

شاہد مختار

افلاطون کے حالات زندگی

افلاطون آسمان فلسفہ کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جس کے بارے میں ایمرسن نے بجا طور پر کہا تھا کہ افلاطون فلسفہ ہے اور فلسفہ افلاطون ہے۔ یہ عظیم فلسفی اور نثر نگار 427 ق م کے لگ بھگ یونان کے مشہور شہر ایتھنز کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔

افلاطون کے باپ کا نام ارسٹون (ARISTON) تھا جو ایتھنز کے ایک قدیم اور ممتاز خانوادے کا فرد تھا جبکہ والدہ کا نام پیرا کیٹون یا پیرکیشن (PERICTIONE) تھا جن کا تعلق بھی ایتھنز کے ایک نامی گرامی خاندان سے تھا۔

حسب نسب اور جاہ و دولت کی بنا پر افلاطون کا نام اس کے دادا کے نام پر ارسٹا کلیس یا ارسٹو کلیز رکھا گیا لیکن بچپن سے ہی اچھی صحت اور چوڑے چکلے جسم کے باعث ایک استاد نے اس کا نام پراٹون رکھ دیا جو بعد میں معرب ہو کر پہلے فلاطون اور پھر افلاطون ہو گیا۔

افلاطون کے دو بڑے بھائی تھے جن کے نام گلاکون اور ایڈی منتاس تھے۔ گلاکون افلاطون کا بڑا بھائی تھا وہ ایک ڈرامہ نویس تھا اور سوفسطائی خیالات کا حامی تھا اس کا نظریہ تھا کہ "فطری طور پر بے انصافی کرنا بے انصافی برداشت کرنے سے بہتر ہے لیکن جب انسان دونوں قسم کے تجربات سے گزرتا ہے تو وہ باہمی معاہدے پر رضامند نظر آتا ہے اور قانون کا

ہے لیکن جب انسان دونوں قسم کے تجربات سے گزرتا ہے تو وہ باہمی معاہدے پر رضامند نظر آتا ہے اور قانون کا احترام کرنے کا رجحان اپنا لیتا ہے۔ یہ طاقتور کی قوت یا بہتری کا مظاہرہ نہیں بلکہ کمزوروں کی مجبوری کا مظاہرہ ہوتا ہے۔" سوفسطائی فطرت کو قانون کا متضاد تصور کرتے تھے اور نظریہ انفرادیت پر مکمل طور پر قائم تھے۔ افلاطون سوفسطائی مفکر گورجیاس کے نظریات کو انفرادیت کی انتہا اور گلوکن کے نظریات کو معتدل سمجھتا تھا۔

افلاطون ابھی چند سال کا تھا جب اس کا باپ فوت ہو گیا جس پر اس کی ماں نے ایک مشہور سیاسی راہنما پیری کلیس کے ایک جگری دوست سے دوسری شادی کر لی اور اس طرح افلاطون کا بچپن ایک بڑے سیاسی گھرانے میں گزرا۔

افلاطون کے بچپن کا زمانہ ایتھنز شہر کے پر آشوب دور میں گزرا۔ ایتھنز اس سیاہ دور میں جنگ کی تباہ کاریوں کا پوری طرح شکار ہو چکا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ راکھ اور ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ افلاطون کے لڑکپن اور جوانی کا سب سے اہم واقعہ پیلوپونے سوسی جنگ تھی جس میں اس نے سپارٹا کے خلاف جنگ میں حصہ لیا وہ گھڑسوار فوج میں شامل تھا جنگ میں ایتھنز کو شکست ہوئی اور اس کی عظمت خاک میں مل گئی۔ اسی جنگ کے دوران ایتھنز میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کے باعث اس وقت کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔

ایتھنز پر ایک طرف خارجی جنگیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں اور دوسری جانب داخلی مفاسد سر اٹھائے ہوئے تھے۔ جمہوریت کے باعث اشراف امراء بے بس تھے لیکن جنگ کے تھوڑے عرصہ بعد ہی امراء کی حکومت قائم ہونے پر ایتھنز کی فضا ایک بار پھر خون کے دھبوں سے داغدار ہو گئی۔ یہ حکومت تیس امراء پر مشتمل تھی جس میں افلاطون کے بہت سے رشتہ دار شامل تھے۔ سپارٹا کی ایما پر برسر اقتدار آنے والے اس ٹولے میں اس کے ماموں کریٹیاس (CRITIAS) اور اس کے تایا کارمیڈیس (CHARMIDES) کی اندھیر نگری اور آخر میں جمہوریت کے دعویداروں کے تسلط

کے ساتھ بہیمانہ سلوک نے افلاطون کو سیاست سے متنفر کردیا اور وہ عملی سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو گیا۔

افلاطون کے پہلے استاد کا نام کریٹی لس (CRATY LUS) تھا جس نے افلاطون کو ہراقلیتوس کے نظریات کا علم دیا۔ افلاطون نے مروجہ تعلیم کے مطابق فن موسیقی سیکھا اور مذہبی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہومر کی نظموں کو حفظ کیا۔ اس وقت یونان میں غیر ملکی سوفسطائی امراء کے ذہنوں پر حکومت کر رہے تھے اور ہر مضمون پر درس دینے کے عوض بے انتہا دولت کما رہے تھے۔ ان کے اخلاقیات کے درس میں یہ بات خاص طور پر شامل تھی کہ ریاست حکمرانوں کی خواہشات کی غلام ہے لہٰذا افلاطون نے سوفسطائیوں کے نظریات سے مکمل واقفیت حاصل کی اور فیثاغورث کی تصانیف پر بھی غور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی کتاب الجمہوریہ میں پیش کیا گیا فلسفہ فیثاغورث کے فلسفے سے ملتا جلتا ہے۔ افلاطون فیثاغورث کی تھیوری آف لمٹ (Theory of Limit) سے کافی متاثر تھا اور اسی باعث اس نے فیثاغورث کے اس فلسفہ کو کہ انسانی معاشرہ دانائی' دنیاوی عزت اور دھن دولت کے تین حصوں میں منقسم ہے اپناتے ہوئے انسانی روح کو دانائی' جذبہ اور جسمانی بھوک میں تقسیم کیا۔ اسی دوران افلاطون اپنے ماموں کریٹیاس اور تایا کارمیڈس کے ذریعے سقراط تک پہنچا اور اس کی شاگردی میں مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کیا۔

سقراط سے افلاطون کا تعلق بیس برس کی عمر میں شروع ہوا اور آٹھ سال کے گہرے دوستانہ ارتباط میں اس نے تمام دیگر تلامذہ کے مقابلے میں زیادہ عمدگی سے استاد کی تعلیم کی اصل روح کو اخذ کیا۔ افلاطون کے مزاج کی تشکیل میں دراصل سقراط کی تعلیمات کا بڑا دخل ہے۔ افلاطون سقراط کو استاد بھی سمجھتا تھا اور دوست بھی۔ کہا جاتا ہے کہ افلاطون نے جوانی میں چند ایک المیہ ڈرامے بھی لکھے تھا لیکن سقراط کے زیر اثر آنے کے بعد انہیں ضائع کر دیا۔

سقراط کی سزائے موت کے اسباب سیاسی تھے۔اس لیے اس کے شاگردوں کو ایتھنز سے ہجرت کرنا پڑی۔افلاطون بھی ان شاگردوں کے ساتھ مگارا چلا گیا اور مگارا کے ایک مقام یوکلیڈ میں رہ کر اس نے پارمینڈیز کے فلسفے کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ میگارا میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ قیروان اور مصر چلا گیا اور وہاں فلسفے اور ریاضی کا علم حاصل کر کے واپس ایتھنز آیا۔پھر جنوبی اٹلی اور سسلی گیا اور وہاں کے سیاسی و معاشرتی نظاموں کا تجزیہ کیا۔اٹلی میں اس کی ملاقات فیثا غورثیوں سے ہوئی اور وہ فیثا غورثی فلسفے سے روشناس ہوا۔تارن ٹم کی فیثا غورثی نو آبادی کے لوگوں سے ربط و ضبط کے باعث وہ ریاضی میں اقلیدس کے قاعدوں کے طریقوں کا قائل ہوا۔وہ فیثا غورث کے اعداد و شمار کے فلسفہ سے اس قدر متاثر تھا کہ ایک بازنطینی کے مطابق علم ہندسہ سے ناواقف شخص کو افلاطون کی اکادمی میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔

افلاطون جب سسلی پہنچا تو اس وقت وہاں ڈیونی سی اوس (diony sius) کی حکومت تھی۔وہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اس نے کارتھیج اور یونانی ریاستوں سے اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔اس کے دربار میں علم دوستی اور فن پروری عروج پر تھی اور طبقہ اشراف جس میں اس کا بہنوئی دیون بھی شامل تھا کا کافی اثر ورسوخ موجود تھا۔ دیون فیثا غورثی جماعت سے تعلق رکھتا تھا اور اسی واسطہ سے افلاطون کو ڈیونی سی اوس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔

افلاطون نے ابتدا میں تو بادشاہ پر اپنے خیالات کا بہت اچھا اثر ڈالا لیکن پھر محلاتی سازشوں اور اشراف پارٹی کی مخالفت کے باعث بادشاہ کے زیر عتاب ٹھہرا اور اسے شہر بدر کر کے یونان جانے والے ایک جہاز پر چڑھا دیا گیا۔اسی جہاز سے سپارٹا کا سفیر بھی واپس جا رہا تھا۔ان دنوں سپارٹا اور ایتھنز میں دوبارہ جنگ چھڑ چکی تھی۔سپارٹا کے سفیر کو درپردہ ہدایت دی گئی کہ وہ افلاطون کو کسی طرح ٹھکانے لگا دے۔سفیر نے راستے میں اسے آئی گینا کے جزیرے پر اتار کر غلاموں کی منڈی میں پہنچا دیا۔ان دنوں آئی گینا کی

حکومت جنگ میں سپارٹا کی حامی تھی اور یہ قرار داد منظور کر چکی تھی کہ اگر جزیرہ پر کوئی ایتھنز کا باسی نظر آئے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اس سے پہلے کہ افلاطون پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ایک قیروانی فلسفی انیسی اس جو سیری نیک سکول کا بانی تھا اور افلاطون کو اس کے نظریات کے حوالہ سے جانتا تھا کی علم دوستی کام آئی اور اس نے اس قیمتی غلام کو خرید کر آزاد کر دیا۔ لہٰذا وہ سسلی میں غلاموں کی منڈی سے رہا ہو کر واپس ایتھنز آ گیا۔

ایتھنز پہنچ کر افلاطون نے جمنیزیم کو ایک مدرسے کی شکل دے کر باقاعدہ تعلیم و تدریس کا آغاز کیا۔ بعد ازاں افلاطون نے اس مدرسہ کو اکیڈیمی کی شکل دیتے ہوئے ایک باغ میں منتقل کر لیا۔ اس اکیڈیمی میں ریاضی، قانون اور سیاسی نظریات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ عطیات کے ذریعے اکیڈیمی کی ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا۔ اس اکیڈیمی میں باقاعدہ خطبات کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی اور اس اکیڈیمی کے ارکان ہر ماہ مل کر کھانا کھاتے تھے۔

368ق م میں سسلی کے بادشاہ ڈیونی سی اوس کا انتقال ہو گیا اور تخت پر اس کا بیٹا ڈیونی سی اوس دوئم بیٹھا۔ ڈیون نے افلاطون کو اس نئے بادشاہ کی تربیت کے لیے بلایا۔ اگرچہ افلاطون اس پر راضی نہ تھا لیکن ڈیون کے اصرار پر وہ سسلی پہنچا۔ بد قسمتی سے ڈیونی سی اوس دوئم اپنے مزاج میں انانیت اور حسد کے باعث ڈیون کی وفاداری کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا اور اس نے افلاطون کی نیت پر بھی شک کیا۔ لہٰذا افلاطون واپس ایتھنز چلا آیا۔

361ق م میں ڈیونی سی اوس دوم کے اس وعدہ پر کہ وہ ڈیون کے بارے میں افلاطون کی خواہشات کا احترام کرے گا ایک بار پھر سسلی گیا لیکن بادشاہ نہ تو اپنے عہد پر قائم رہا اور نہ ہی تعلیم میں کوئی دلچسپی لی۔ لہٰذا افلاطون اس بار بھی ناکام واپس لوٹا۔ چند سال بعد ڈیون نے ڈیونی سی اوس دوم پر حملہ کر کے اسے تخت سے محروم کر دیا لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی اور صرف تین برس بعد ڈیون کو قتل کر دیا گیا اور اسطرح افلاطون کی یہ

امید کہ تبحر علمی کے ذریعے سوراکوسے کے شہریار کو مثالی فلسفی حکومت بنایا جاسکتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

افلاطون سقراط کے سیاسی فلسفے سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے سقراط کے بے شمار خیالات و اعتقادات کو اپنی کتب میں اپنے حوالے سے پیش کیا۔ اس نے اپنی جملہ کتب مکالمات کی صورت میں تحریر کیں جو سقراط ہی کا طریقہ کار تھا۔ اس نے سقراط کی طرح تشبیہ اور مشابہت کو اپنی تحریروں میں اپنانے کے علاوہ اپنے تصورات کی بنیاد سقراط کے نظریہ علم' نظریہ حقیقت اور نیکی کے علم پر رکھی۔ افلاطون نے سقراط کے اس نظریہ علم کو کہ "ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ سچا اور حقیقی علم تلاش کرے جو انسان کی اپنی ذات میں پنہاں ہے" اپناتے ہوئے تخصیص فرائض کا فلسفہ پیش کیا۔ اور سقراط ہی کے اس نظریہ سے کہ "اشیاء کی حقیقت تصور اشیاء میں مضمر ہے اور خارجی صورت عارضی ہے" سے متاثر ہو کر تصوریت کی اصطلاع استعمال کی۔ سیبائن کہتا ہے کہ افلاطون کے سامنے 'الجمہوریہ' کی بنیادی شکل میں' اس کے استاد سقراط کا یہ تصور" کہ نیکی علم ہے "موجود رہا۔ فاسٹر کے مطابق افلاطون نے جو کچھ سقراط سے حاصل کیا وہی اس کے سیاسی فلسفہ پر چھایا ہوا ہے۔ سقراط کے خیال کے مطابق حکومت صرف عالموں کا حق ہے اور اسی تصور کی بنیاد پر افلاطون نے عالموں کی حکمرانی کا فلسفہ پیش کیا اور یہی فلسفہ اس کی مثالی ریاست اور فلسفی حکمرانوں کے پس پردہ کار فرما ہے۔ بلاشبہ سقراط نے دنیا کے اس سب سے بڑے مصنف میں ایک شان اصلاح، اس بے مثل معلم میں شان تدبر اور اس مفکر اعظم میں شان پیغمبری پیدا کی۔

افلاطون کے زمانے میں ایتھنز کی حکومت اپنے زوال کی منازل طے کر رہی تھی۔ شہری ریاستیں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ہر شہری ریاست مختلف الخیال طبقات میں بٹ چکی تھیں۔ ایک طبقہ شہری ریاست پر حکومت کرنے والوں کا تھا جبکہ دوسرا رعایا کا۔ حکمران جابر تھے اور رعایا محکوم و مجبور۔ حکمران اخلاقی ضوابط سے بے

نیاز ہو کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جبکہ محکوم لوگ کمزور سے کمزور تر اور غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس طرح ہر شہری ریاست میں حکمرانوں اور رعایا کے درمیان بیگانگی اور نفرت کی خلیج روز بروز وسیع ہو رہی تھی۔ ان حالات میں جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں سقراط کی موت کے بعد افلاطون جمہوریت پسندوں کا دشمن ہو گیا اور اس نے دولت مندوں کے ذریعے ایتھنز کو سیاسی زوال سے بچانے کے لیے سیاسی مفکر کی حیثیت اختیار کی۔

افلاطون نے اپنی قائم کردہ اکیڈیمی میں ریاضی، سائنسی علوم اور فلسفہ و منطق پر جو لیکچر دیئے تھے زمانہ کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس نے اپنے آخری ایام میں صرف مابعد الطبیعیات پر تنقیدی مقالات تحریر کیے۔ اس نے اپنے ہمہ گیر فلسفیانہ نظام کی تشکیل کے لیے قدما کے خیالات و نظریات سے استفادہ حاصل کیا اسی لیے اس کی فکر پر خاندانی ماحول کے علاوہ فیثا غورث، سقراط اور سوفسطائیوں کے افکار کی جھلک نمایاں ہے۔ ایک متمول اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ اعلیٰ مرتبہ کے حامل لوگوں کو حکومت کرنے کا حقدار اور جمہوریت کو بدترین طرز حکومت قرار دیتا تھا۔

افلاطون کہا کرتا تھا کہ ''جمہوریت محض دھوکہ اور فریب ہے عام لوگوں کی رائے کو حقیقت یا علم کا درجہ دینا جہالت ہے کیونکہ رائے تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جمہوریت مستقل کشمکش اور فتنہ و فساد ہے'' افلاطون مضبوط، مستحکم اور پائیدار حکومت کا قائل تھا جس کی اس دور میں ایتھنز کو ضرورت تھی۔ وہ مملکت کے زوال کی پہلی وجہ نام و نمود، نمائش اور شان و شوکت کی خواہش کو قرار دیتے کہتا ہے کہ ''اس سے حکمران غافل ہو جاتے ہیں اور خوشامدیوں میں گھر کر اپنے اعلیٰ مقاصد کو بھول جاتے ہیں جس سے عام شہری خوف و ہراس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مملکت چند سری ہو کر رہ جاتی ہے اور جمہوریت کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں۔ جمہوریت سے گروہ بندی اور پھر سیاسی جماعتیں جنم لیتی ہیں۔ چالباز اور مکار ان پارٹیوں کے لیڈر اور ان

میں سے مطلق العنان یا جابر حکمران بنتے ہیں جن کا دل عقل کی روشنی اور اخلاق کی رہبری سے محروم ہوتے ہیں۔"

افلاطون نے سوفسطائیوں کے اس نظریہ کہ "ریاست حکمران طبقہ کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہوتی ہے" کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ رعایا کی بھلائی ہی حکمرانوں کی بھلائی ہے اور ریاست اچھائی کے فروغ اور بہتر عوامی زندگی کے لیے تشکیل دی جاتی ہے" افلاطون انفرادیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تصوریت پسند بھی تھا۔ انفرادیت پسند ہونے کے ناطے وہ تسلیم کرتا تھا کہ "انسان نے ریاست اپنی ضروریات کی تکمیل کی خاطر تشکیل دی ہے اور ریاست فرد کی طرح ایک عضریتی فرد ہے اور یہ ریاست کا فرض ہے کہ افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق جسمانی اور روحانی نشوونما کے لیے بہترین مواقع فراہم کرے" جبکہ بحیثیت ایک تصوریت پسند اس کا کہنا ہے کہ "کوئی ریاست اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک حکومت ایسے اشخاص کے پاس نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ ریاست کی بہتری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے"۔ اس کے نزدیک حکومت صرف عالموں کا حق ہے اور تعلیم ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے نیک اور بہترین انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک صرف مخصوص لوگ اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اس لیے ان اعلیٰ صفات کے حامل لوگوں کو معاشرے میں اعلیٰ اور کم صفات کے حامل لوگوں کو کم مقام حاصل ہونا چاہیے۔ افلاطون کے معاشرے میں تین طبقاتی تقسیم اور اس تقسیم کی انسانی ذہن سے مطابقت کا تصور دراصل فیثا غورث کے انسانی روح کے تین حصوں کے تصور سے مشابہہ ہے۔ فیثا غورث کے ہاں مادی فوائد (appetite) جاہ و حشمت (Spirit) اور عقل و دانش (Reason) کے حامل تینوں گروہوں کو افلاطون نے معاشی، فوجی اور فلسفی حکمران کے تین طبقوں میں تقسیم کرتے ہوئے درجہ بندی کی ہے جو فیثا غورث کے ہاں موجود نہیں ہے۔ فیثا غورث کی طرح

ضروری قرار دیتا ہے۔اس کے خیال میں نظری اعتبار سے علم ریاضی کے ذریعے کسی بھی چیز کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہے جبکہ عملی اعتبار سے میدان جنگ میں فوجیوں کو بہتر طور پر منظم اور مخالفین پر عددی اعتبار سے فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔اس کے خیال میں ریاضی ہی کی مدد سے انسان عام محسوسات سے بلند ہو کر خالص خیالات کی دنیامیں داخل ہو سکتا ہے اس کے نزدیک ایک ریاست اپنے ترکیبی عناصر میں اگر علم ہندسہ کے مطابق صحیح طور پر تقسیم ہو تو وہ کائنات کی مانند ہے جو موسموں' مہینوں' سالوں اور دن رات کے چکر میں تقسیم ہے اور یہی ہندسے کائنات کی حرکت کا احاطہ کرتے ہیں۔

سقراط سے قبل ڈیلفی کے اخلاقی ضابطہ کا پرچار تھا جو دراصل مروجہ غیر انسانی اور غیر ہمدردانہ قوانین اور رسم و رواج کے خلاف ایک معتدل اجتہاد تھا اس اخلاقی ضابطہ کا بنیادی نظریہ ,کسی چیز کی زیادتی نہیں بلکہ ہر چیز ایک حد کے اندر' تھا۔ڈیلفی کی اس اخلاقی تعلیم کے ذریعے نیکی اور بدی' اچھائی اور برائی' انصاف اور بے انصافی کی وضاحت کی گئی تاکہ سماجی انصاف کا ایک حتمی اور آفاقی تصور قائم ہو سکے۔اسی اخلاقی تعلیم کو آگے بڑھاتے ہوئے پہلے سقراط نے تھیوری آف نالج اور پھر افلاطون نے تھیوری آف آئیڈیاز پیش کیں تھیوری آف آئیڈیاز میں افلاطون نے اپنے استاد کے نظریات کو اپنے قالب میں ڈھالتے ہوئے حقیقی سماجی انصاف کے اصول پر مبنی ایک حتمی اور آفاقی تصور پیش کیا۔

افلاطون کے ان تصورات پر اس کے استاد سقراط کی گہری چھاپ ہے۔نیک زندگی کا حصول, اخلاقیات اور علم کی بالادستی کا تصور, نظریہ عدل, مکالماتی طریقہ مطالعہ, جمہوری طرز حکومت سے نفرت, قانون اور فلسفی حکمرانوں کی تابعداری کے تصورات دراصل سقراط کے ہیں جنہیں افلاطون نے اپنے تصورات میں شامل کیا ہے سقراط کے نیک زندگی کے تصور کو افلاطون الجمہوریہ میں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "مثالی مملکت کا مقصد اور نصب العین نیک زندگی کا حصول ہے" اخلاقیات کی بالادستی کے سقراطی تصور کو افلاطون اس طرح بیان کرتا ہے کہ "معاشرے کا تصور اخلاقی بنیادوں پر

استوار ہونا چاہیے"۔

سقراط کے مکالماتی طریقہ جس کے ذریعے سقراط کے تمام تر تصورات کو فروغ حاصل ہوا کو افلاطون نے اپنی تقریباً تمام تصانیف میں استعمال کیا۔ "نیکی ایک علم ہے" کا تصور تاریخ میں سب سے پہلے سقراط نے پیش کیا جسے یونان میں بڑی پذیرائی ملی اور افلاطون بھی اس تصور سے متاثر ہوا۔ ایتھنز کی جمہوری حکومت نے چونکہ سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا تھا اس لیے افلاطون نے اپنے نظریات میں جمہوریت کو بدترین اور اشرافی طرز حکومت کو بہترین طرز حکومت قرار دیا۔ سقراط نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی قانون سے روگردانی کرنے سے انکار کر دیا تھا جس سے افلاطون بے حد متاثر ہوا۔ افلاطون سوفسطائی مکتبہ فکر سے بھی متاثر ہوا لیکن منفی انداز میں۔ اس نے سوفسطائی افکار پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "مملکت محور کل ہے مملکت فرد کی فردیت کی ضامن ہے۔ مملکت ہی وہ اعلیٰ و برتر ادارہ ہے جسکی تکمیل کے لیے دیگر تمام ادارے اور افراد اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ فرد مملکت کا ایک ادنیٰ جزو ہے اور جزو ہونے کے ناطے اس کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ ایک کل کی مکمل تکمیل کے لیے دیگر اجزا کے ساتھ مل کر سرگرم عمل رہے"۔

تمام قدیم مورخین افلاطون کی سیرت کو قابل احترام قرار دیتے ہیں اور اس کی تصانیف بھی اس کی علو سیرت کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ نہائت اعلیٰ درجے کی عقل کا مالک تھا جس کی تمام قوتوں میں توازن قائم ہو کر اخلاقی جمال پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی یہ تصانیف اس کی پاکیزہ سیرت کا آئینہ ہیں۔ اس کا دور تصنیف سقراط کی وفات سے فوراً بعد شروع ہوا اور آخری دم تک جاری رہا۔ وہ پچاس برس سے زیادہ عرصہ تک اپنی تصانیف کی تکمیل میں مصروف رہا۔

آیئے افلاطون کی ان تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

افلاطون کی تصانیف

افلاطون کی تمام کتب مکالمات کی شکل میں ہیں اور ان مکالمات میں افلاطون نے اپنے خیالات اور نظریات کو سقراط کے منہ سے کہلوایا ہے۔ اس کے مکالمے بڑے ڈرامائی انداز کے ہیں اور وہ اپنے مکالمات میں مختلف کرداروں کے منہ سے سوال وجواب اور بحث مباحثے کی شکل میں اپنا مدعا پیش کرتا ہے۔ اس کی تحریروں میں سنجیدگی اور مزاح دونوں عناصر ایک خاص تناسب میں موجود ہیں۔ وہ کسی عقلی مسئلہ کے حل نہ ہونے پر دیومالائی قصوں اور مافوق مثالوں کا بھی ذکر کرتا ہے جس پر اسے آئیڈیلسٹ (Idalist) بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کی پیش کردہ دیومالائی قصے اور تمثیلیں آج بھی ادب وفن کی بہترین شاہکار مانی جاتی ہیں۔

افلاطون نے تاریخ فلسفہ یونان میں پہلی بار ایک ایسا نظام فکر پیش کرنے کی کوشش کی جو کائنات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً اخلاقیات، علمیات، طبعیات اور سیاسیات وغیرہ کا مکمل طور پر احاطہ کر سکے۔ افلاطون نے باقاعدہ نظریات کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بیان کردہ نظریات میں سے نظریہ علم (Theory of knowledge) نظریہ امثال (Theory of Lacas) نظریہ موجودات (Theory of Epistence) انسانی روح کے بقائے دوام کا نظریہ (The theory of immorality of the human) نظریہ اخلاق (Moral theory) اور نظریہ ریاست (Theory of state) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ افلاطون اپنے بیشتر نظریات میں اپنے استاد سقراط کی تقلید کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اس کے باوجود اس کے اپنے نظریات بھی اپنی جگہ پر ایک امر حقیقت ہیں۔ اس نے اپنے نظریات کی روشنی میں فلسفہ یونان کے کینوس کو نہ صرف وسیع کیا بلکہ نئے علوم پر نئی تحقیقات کر کے انہیں اس قابل بنایا کہ انہیں عام زندگی میں استعمال میں لایا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ "آسمان، نجوم و کواکب، شمس و قمر اور بادو آب کے مطالعے سے واقفیت تو ضروری ہے لیکن ان سے کوئی مثبت اور تعمیری کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ انسان کو انفرادی زندگی اور اجتماعی مسائل کی طرف توجہ دینا زیادہ عملی اور منطقی بات ہے"

افلاطون کی تحریر و تصنیف کا عرصہ چالیس پچاس سالوں سے کم نہیں ہے اور اس کے تمام مکالمات بے ترتیب انداز میں ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کے مقالات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اس کی تحریروں کا پہلا دور ان مقالات پر مشتمل ہے جو سقراط کی موت کے فوراً بعد لکھے گئے اور جن میں پیش کردہ خیالات دراصل سقراط ہی کے خیالات کا عکس ہے۔ افلاطون نے سقراط کو ایک ایسے شخص کے روپ میں پیش کیا ہے جو تمام مفروضوں اور رویوں کا بے باکی سے معروضی جائزہ لینے کا متمنی ہے۔ دلائل کا پہاڑ اسے چاہے جدھر لے جائے وہ بے مزہ نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ افسانہ طرازی ہے اور سقراط کی برتری کی روداد امر واقعہ کی بجائے افلاطون کے ذہن رسا کا کارنامہ ہے۔ دوسرا حصہ ان مکالمات پر مشتمل ہے جو اس نے دوسرے ممالک کے سفر کے دوران لکھے اور جن میں اس کے ذاتی فلسفہ کی جھلک موجود ہے جبکہ تیسرا اور آخری دور ان مکالمات پر مشتمل ہے جس میں وہ اپنے خیالات کو بیان کرنے کی مکمل قدرت رکھتا تھا۔

پہلے دور میں لکھے گئے مکالمات کی تفصیل اس طرح ہے۔

Hippias minor_1

The Lysis_2

The Charmides_3

4۔"The" Laches

5۔"The "Euthyphro

6۔"The"Apology

7۔"The" Crito

8۔"The" Protogoras

آخری مقالہ پروٹے گورس کافی طویل مقالہ ہے اور اس میں بڑے پیچیدہ خیالات پیش کیے گئے ہیں جبکہ پہلے چار مقالات مختصر اور عام فہم ہیں۔

دوسرے دور میں اس نے

1۔Gorgias

2۔Theaetalus

3۔Sophists

4۔Statesman

5۔Paminides

جیسے مقالات تحریر کیے۔اس دور میں اس نے تھیوری آف آئیڈیاز (Theory of Ideas) پیش کی جس کا مرکزی خیال سقراط کی تھیوری آف نالج ہے۔ افلاطون کے باقی سارے فلسفے کا دارومدار اسی تھیوری پر ہے۔گورجیاس میں اس نے سوفسطائی نظریات کورد کیا ہے جبکہ Theaetetus میں اس نے ثابت کیا ہے کہ مختلف افراد کا ذاتی نکتہ نظر یا تاثر کبھی بھی اصلی اور حقیقی اپنا علیحدہ وجود رکھنے والی نیکی یا انصاف سے ممثل نہیں ہو سکتا۔

تیسرے دور میں اس نے "Timaeus", "Republic", "Phaedo" جیسے مقالات تحریر کیے۔ ٹائماس تخلیق کائنات ری پبلک سیاسیات اور فیڈو روح کے فانی یا غیر فانی ہونے کے بارے میں ہیں۔

سات جعلی مکالمات چھوڑ کر جنہیں زمانہ قدیم میں بھی موضوع خیال نہیں کیا جاتا تھا پینتیس مکالمات, ایک مجموعہ تعریفات اور تیرہ یا اٹھارہ خطوط ایسے ہیں جو داخلی شہادت کے علاوہ ارسطو کی شہادت سے مصدقہ ہیں ارسطو نے ریپبلک ' ٹائیمس, قوانین , فیڈو , فیڈرس , سپوزیم , گورجیاس , مینوپیاس کا بالواسطہ اور تھیمیس, فلیوس , سوفسٹ, پولیٹیکس بلاواسطہ اور اپالوجی' پروٹاگورس اور کریٹو کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ اس میں قطعاً شبہ نہیں رہتا کہ وہ ان تصانیف کو افلاطون کی تصانیف سمجھتا ہے۔

یوں تو افلاطون نے بہت سی کتابیں تحریر کیں مگر زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے بچ کر درج ذیل کتب ہی ہم تک پہنچ سکیں۔

1۔اپالوجی (Apology) اس کتاب میں سقراط پر مقدمہ کی روداد اور اس کی صفائی بیان کی گئی ہے۔ خطابت پردازی کا جو کرشمہ اس میں رچا ہوا ہے وہ افلاطون کے زور قلم کا نتیجہ ہے اس مکالمے کو پڑھ کر سقراط کے رویے کے شعوری اور لاشعوری محرکات سے آگاہی ہوتی ہے وہ اپنی تقریر کے آخر میں جج صاحبان کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "آپ جج حضرات کو چاہیے کہ موت کے بارے میں اچھی توقعات وابستہ کریں۔ کم سے کم اس بات کی حقیقت پر ایمان رکھیں کہ ایک نیک آدمی کو کوئی برائی ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی نہ اس دنیا میں' نہ اس دنیا میں اور نہ ہی کبھی اللہ کی طرف سے۔ اس کے معاملات نظر انداز کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے میرا یہ انجام بھی محض اتفاق نہیں ہے بلکہ مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ میرے لیے اب مرنا اور دنیا کی تکالیف سے چھٹکارا پانا ہی بہتر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے الہامی نشان نے مجھے ٹوکا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں ان سے قطعاً خفا نہیں جنہوں نے مجھے مجرم ٹھہرایا یا جنہوں نے مجھ پر الزام لگائے ہیں۔ تاہم جب انہوں نے مجھ پر الزام لگائے تھے تو ان کی نیت یہی تھی کہ مجھے نقصان پہنچائیں بس اسی معاملے میں وہ مورد الزام ہیں۔ مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔ جب میرے بیٹے بڑے ہو جائیں اور پھر اگر وہ نیکی کے مقابلے میں مال و دولت کو ترجیح دینے لگیں تو آپ لوگ انہیں

ایسے ہی تنگ کیجیئے گا جیسے میں آپ لوگوں کو کیا کرتا تھا۔ اگر وہ یہ ظاہر کرنے لگیں کہ بڑی اہم شخصیت بن گئے ہیں جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو تو ان کا محاسبہ کرنا جیسے میں آپ کا محاسبہ کیا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی حفاظت نہیں کر رہے جس کی حفاظت کرنی چاہئے تھی اور اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگ گئے ہیں جبکہ حقیقت میں نہیں ہیں۔ اگر آپ لوگ ایسا کریں گے تو میں اور میرے بیٹے دونوں آپ کے ہاتھوں صحیح انصاف پائیں گے۔ اب جانے کا وقت آ گیا ہے ہم اپنے اپنے راستوں کی طرف جاتے ہیں۔ میں مرنے کو اور آپ زندہ رہنے کو۔ کون سا راستہ بہتر ہے اللہ ہی کو معلوم ہے۔"

2۔ کرائٹو (Crioto) اس کتاب میں سقراط کو بغیر کسی معقول الزام کے جیل میں ڈالے جانے اور اس کے وہاں سے فرار ہونے کے پروگرام کی تشکیل اور سقراط کے انکار کے بارے میں مکمل دلائل روداد کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ سقراط نے زندان سے فرار ہونے سے کیوں انکار کیا۔ اگرچہ سقراط عمر بھر ایتھنز کی تمام حکومتی پالیسیوں اور سیاسی راہنماؤں پر تنقید کرتا رہا لیکن یہاں وہ اس بگڑی ہوئی ریاست سے اپنی عمیق اور سادہ وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔ بے شک ایتھنز نے اپنے اداروں کی غلط روی سے اسے غیر منصفانہ اور احمقانہ طور پر موت کی سزا سنائی لیکن عمر کے جو ستر سال اس نے ایتھنز میں بسر کیے وہ ریاست کے قوانین اور رسوم کے ساتھ ایک خاموش میثاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سقراط اس تحفظ کا شکر گزار ہے جو ان قوانین کی وجہ سے اسے نصیب ہوا۔ وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں دینا چاہتا اور نہ ہی قانون کی خلاف ورزی اسے منظور ہے۔

3- ایو تھیفرون (Euthyphron) سقراط پر بدکرداری کا الزام، مقدمے کا انتظار، تقویٰ اور نیکی پر بحث اس مکالماتی کتاب کا اصل topic ہے۔

اس میں سقراط عدالت جا رہا ہے جہاں اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ راستے میں اسے ایو تھرفرو نامی نوجوان ملتا ہے جو انصاف کی خاطر خود اپنے باپ جس نے بڑی بے دردی

سے ایک غلام کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا پر مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہے۔اس حوالے سے سقراط اتقا پر بات کرتے ہوئے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایو تھر فرو کے ذہن میں اتقا کا کیا تصور ہے۔ایو تھر فرو نے اتقا کی کئی تعریفیں پیش کیں جن میں سے کوئی بھی سقراط کی جرح کی متحمل نہیں ہو سکی اس بحث کے خاص نقطہ کے ذریعے بالواسطہ انداز میں سقراط پر عائد فرد جرم کی مہملیت کو واضح کیا گیا ہے۔اعتذاز میں صنائی کا وہ بیان ہے جو سقراط نے عدالت کے سامنے دیا۔اس مکالمے کو پڑھ کر سقراط کے رویے کے شعوری اور لاشعوری محرکات سے حیرت ناک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

4۔لاشز(Lashes) یہ مکالماتی کتاب جرات کے موضوع پر تحریر کی گئی ہے۔

5۔آیون(Ion)

شعراء اور خطبا کے خلاف مکالماتی کتاب ہے۔

6۔پروٹاگورس(Protagoras) اس کتاب میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ علم فضیلت موجود ہے اور اس کی تعلیم ممکن ہے۔پروٹاگورس میں ڈرامے کا سا لطف ہے۔ سقراط ایک مشہور سوفسطائی معلم پروٹاگورس سے پوچھتا ہے کہ آیا نیکی یا اچھی صفات سکھائی جا سکتی ہیں۔پروٹاگورس کا جواب ہاں میں ہوتا ہے جسے سقراط نہیں مانتا۔دونوں کے نظریات متضاد ہونے کی وجہ سے مثبت نتائج بر آمد نہیں ہوتے ہیں لہٰذا آخر میں اشارتاً کہا گیا ہے کہ سقراط اور پروٹاگورس کو اصل میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے تھا کہ نیکی سے کیا مراد ہے۔

7۔کارمیڈس(Charmides) یہ تصنیف عفت یا ضبط نفس کے بارے میں ہے۔

8۔لی سِز(Lysis) یہ کتاب رفاقت کے بارے میں ہے لیکن رائٹر نے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

9۔جمہوریہ (Republic) یونانی زبان میں Republic کا مطلب بلا تخصیص آئین مملکت اور معاشرہ ہے اور افلاطون چونکہ اس تصنیف میں ان معاشرتی مسائل کو ہی زیر بحث لایا ہے لہٰذا اس کتاب کا عنوان بھی اس نے Republic رکھا۔یہ کتاب افلاطون

کی مثالی مملکت کے آئین کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے اپنی مثالی مملکت کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن نظام ہائے زندگی کی ضرورت محسوس کی ان پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب سیاست اور فلسفہ کو ایک ہی دھاگے میں پروتی ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ عدل کے بارے میں ہے جبکہ حصہ دوم سیاست کا تصور مثالی ریاست اور عام دنیاوی ریاستوں میں فرق پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں افلاطون کے بنیادی نظریے اور اصول ہیں جنہیں دلیلوں اور مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سماج کی تشکیل سیاسی تنظیم کی ماہیت اور مثالی مملکت کے اجزائے ترکیبی کے علاوہ زندگی کے بنیادی عمل کو اجاگر کرنے کے لیے اخلاقی فلسفیانہ مذہبی، تعلیمی، نفسیاتی مابعد الطبعیاتی اور تاریخی بلکہ غیر سیاسی نظریے جو اس دور میں یونان قدیم کے علم سیاسیات کے حصہ تھے بیان کئے گئے ہیں۔

یہ ایک مکالمہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ سیاسی اور معاشرتی فتنوں پر صرف فلسفی حکمران قابو پا سکتا ہے اور وہی انصاف کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اس تصنیف میں صحیح فلسفی پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے جس کے لیے تعلیم اور معاشرے کی تنظیم میں کار فرما اخلاقی اصولوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ روح کے تینوں حصوں نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمعنہ کی طرح معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نچلے طبقے کو جس کے ذمہ معاشرے کی تمام مادی اور معاشی ضروریات کو پورا کرنا ہے کو نفس امارہ یعنی شکم، سورماؤں کے طبقہ کو نفس لوامہ یعنی دل اور حاکموں کے طبقہ کو نفس مطمعنہ یعنی دماغ قرار دیا گیا ہے۔ اس تصنیف میں نظام تعلیم، نظام عدل اور نظام معیشت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ مشہور اور بحث انگیز تصنیف دس ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے دسویں حصہ میں ایرامنی کے مرنے اور بارہویں دن جی اٹھنے کے بعد منی میں جزا و سزا کے نظام، روحوں کو دوبارہ انسانی یا حیوانی قالب اختیار کرنے اور عالم ناسوت سے واپسی کا نظریہ جو غالباً آواگون سے مشابہ ہے بیان کیا گیا ہے۔

افلاطون کا سیاسی فلسفہ اس کی تین کتابوں "جمہوریہ" مدبر" اور

قانون" میں ملتا ہے۔ ان کتابوں میں مشہور کتاب "جمہوریہ" ہی ہے جس میں افلاطون نے معلوم تاریخ میں پہلی دفعہ ایک تمدن اور مہذب معاشرتی زندگی کے ایسے مسائل پر بحث کی ہے کہ گزشتہ صدیوں کے دوران ہر زمانے میں ہر معاشرہ ان مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا آ رہا ہے اس کی یہ تصنیف آج بھی مغربی سیاسی و تمدنی زندگی کی فلسفیانہ اساس ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پیش کردہ تصورات و نظریات نے تاریخ انسانی میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

قدیم یونان میں چونکہ Specialization کی کمی تھی اس لیے افلاطون کی اس تصنیف میں اخلاقیات' معاشیات' سیاسیات اور تاریخ میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی ہے اور یہ کتاب بیشتر موضوعات کا مرکب ہے۔ چونکہ اس وقت یونان کی تمدنی زندگی فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر آمریت کی طرح چھائی ہوئی تھی اُس لیے اس کتاب کا بنیادی موضوع بحث شہری مملکت ہے۔ افلاطون نے اس کتاب میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لیے عمرانی علوم کے تمام طریقہ ہائے مطالعہ جن میں استخراجی جدلیاتی' مکالماتی' مشابہتی' مقصدیتی' تجزیاتی' تاریخی اور استقرائی طریقہ ہائے مطالعہ شامل ہیں استعمال کیے ہیں۔

اس زمانے میں اہل مقدونیہ میں جہل کی کثرت تھی اور کوئی مثالی حکومت بھی ابھی موجود نہیں تھی۔ افلاطون نے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی اس مشہور زمانہ کتاب "جمہوریہ" میں ایک مثالی ریاست کا نظام دیا جس کی مدد سے وہ ایک فلسفی بادشاہ پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ صرف چند آدمیوں کی محنت و مشقت سے انسانیت اوج ثریا تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر آدمی عقل و فہم رکھتا ہے لیکن ہر کوئی اسے استعمال نہیں کرتا۔ وہ در حقیقت مثالی ریاست کے روپ میں ایسا باغ تشکیل دینا چاہتا تھا جس کی چار دیواری میں صرف اعلیٰ درجے کے اور نایاب پودے ہی پرورش پا سکیں۔
مشمولات کے اعتبار سے الجمہوریہ کو افلاطون کی وفات کے بعد لسانی کے

اعتبار سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سیاسیات کے علاوہ تعلیم 'انصاف' اخلاقیات' فلسفہ' مذہب' خاندان اور نجی ملکیت پر بحث کی گئی ہے۔ معاشرتی زندگی پر حصہ اول سے پانچویں تک عدل کی ماہیت' مثالی مملکت کی تنظیم' نظام تعلیم اور اخلاقیات چھٹے اور ساتویں حصہ میں الطبعیاتی مسائل' فلسفی حکمرانوں کی خصوصیات' مطالعے کے مضامین' تعلیم وتربیت اور اشتمالی تصورات آٹھویں اور نویں حصہ میں ناقص معاشروں پر بحث اور آخری باب میں فلسفی حکمرانوں کے کردار' شاعری کے مضر اثرات اور حیات بعد الموت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے لیکن زیادہ تر توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پر ہے۔ فلسفہ کی بلندی' اتحاد کا جلوہ' اخلاق کا سبق' تعلیم کے مسائل' سیاسی زندگی میں راہنمائی' عروج وزوال کا اسرار و رموز اور فلسفہ تاریخ کے مشکل ابواب سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے جسے افلاطون نے اپنے مرکزی خیال "آدمی اچھا کیسے بنے" کی خاطر بحث کے طور پر شامل کیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہر اچھا انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت یا ریاست کا رکن بنتا ہے اور چونکہ اچھا آدمی صرف اچھی ریاست میں پیدا ہو سکتا ہے اس لیے افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ اور پھر اس ریاست کے لیے فلسفہ اخلاق اور پھر اجتماعی تعاون کے لیے تخصیص کار کے اصول پیش کرتے پڑے۔ افلاطون کے خیال میں چونکہ اجتماعی زندگی ہی سچا اصول عدل ہے اس لیے اس کتاب کو تحقیق عدل کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں نظام تعلیم' ماہیت عدل اور نظام معیشت پر مفصل بحث کی ہے۔ افلاطون کے نزدیک عدل کوئی ہنر مندی یا مہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے۔ حکومت اگر فن ہے تو اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا اور حکمران کے لیے اگر وہ سچا حکمران ہے بے غرض اور

محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانش مند، زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر نہیں ہے بلکہ کل کا جوہر ہے اور اسی باعث تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت وجرات سے ریاست کی حفاظت کرے دولت مندوں کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کروائے۔ مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے۔

الجمہوریہ میں جو نظام تعلیم پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے ہے پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لیے تیار کرنا ہے جبکہ دوسرے حصے کا مقصد ان میں سے چند کو حکمرانی کا اہل بنانا ہے۔ پہلے حصے میں جذبات کی تہذیب اور سیرت کی تربیت جبکہ دوسرے حصے میں فلسفہ وحکمت کی معرفت، عقل و فرد کی تعلیم پیش نظر ہے۔

افلاطون کی اصطلاح میں ارباب علم اور اصحاب عمل فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خود غرض سیاستدانوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہی لوگ نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں ان پر نہ تو قانون کی پابندی لاگو ہے اور نہ بے جا رسم ورواج کی بندش۔

اس کتاب میں افلاطون نے ریاست کی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک اشتراکی نظام پیش کیا اور اس نظام کی بدولت اسے تاریخ میں اشتراکیت کے بانی کے طور پر یاد رکھا گیا ہے۔ اشتراک املاک کے ساتھ ساتھ اس نے اشتراک ازواج کی حمایت کی جس پر بعض ناقدین خصوصاً ارسطو نے کافی تنقید کی ہے لیکن اس کے نزدیک یہ نظام اشتراکیت فروعی ہے اور وہ اس چیز سے بخوبی واقف تھا کہ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے اس لیے اس کی حقیقی اصلاح ذہن کی اصلاح سے ممکن ہے اور نظام اشتراکیت کا تمام

مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

اس کتاب میں شخصی حکومت کے مقابلہ میں جمہوری حکومت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے قانونی حکومت کو قابل عمل نظام حکومت قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ ''قانون'' میں عملی لحاظ سے اچھی حکومت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ ''ریاست'' میں قانون' عدالت اور قانون دانوں کو غیر ضروری کہا گیا ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں استخراجی طریقہ مطالعہ کو استعمال کر کے خیالات و تصورات پر مبنی فکر کو اجاگر کیا اور بہترین نتائج اخذ کیے۔ اس نے اس تصنیف میں جدلیاتی طریقہ مطالعہ کی بنیاد رکھی اور تضاد کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کو آگے بڑھایا۔ افلاطون کے اس طرز استدلال کو مد نظر رکھتے ہوئے بعد میں ہیگل اور کارل مارکس نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔

افلاطون نے اگرچہ مکالماتی طریقہ مطالعہ کو اپنی تمام تصانیف میں شعوری طور پر اپنایا ہے لیکن الجمہوریہ میں اس نے جن کرداروں کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً تمام حقیقی کردار تھے۔ اس کتاب میں اس نے مشابہتی طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے ایک اہم تمثیل ''فرد اور مملکت ایک دوسرے سے مشابہ ہیں'' پیش کی ہے اور یہ تمثیل بلاشبہ اس تصنیف کی روح ہے۔ اس طریقہ مطالعہ کو استعمال کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ''انسان اور مملکت کے طبقات کے درمیان مماثلت ہے۔ مملکت اور انسانی ذہن میں کوئی فرق نہیں انسانی ذہن تین اجزا یعنی اشتہا' حوصلہ اور عقل کا مجموعہ ہے اور مملکت کے تینوں طبقے معاشی طبقہ' فوجی طبقہ اور حکمران طبقہ اسی ذہنی عکس کی پیداوار ہے۔ اعلیٰ ترین طبقہ فلسفی حکمران' درمیانی طبقہ فوجی اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار اور نچلا طبقہ معاشی طبقہ ہے۔

افلاطون کے نزدیک مثالی مملکت کے سب سے زیادہ قریب طرز حکومت

Timocrasy ہے اور یہ حکومت عقل کی برتری پر قائم ہے۔ عقل کی برتری کم ہو جانے پر اس کی جگہ Spirit اور پھر Appetite کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ افلاطون اس تصنیف میں مقصدیت کا طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تصورات ہی حقیقت ہیں۔ حقیقی مملکت کی تکمیل انسانی زندگی کا اولین مقصد ہے۔ جاری و ساری مملکتیں سب نامکمل ہیں اور یہ مملکتیں مثالی مملکت کے جس قدر قریب ہیں اتنی ہی حقیقت کے بھی قریب ہیں۔" افلاطون کے بعد مقصدیت کے اس طریقہ مطالعہ کو ارسطو اور گرین نے بھی اپنایا ہے۔

افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں تجزیاتی طریقہ مطالعہ کے تحت اپنی مثالی مملکت کو تین طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے سماجی اداروں کو مملکت کے اجزا قرار دیا۔ اس نے تاریخی طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے اپنے مشاہدات میں وہی حقائق بیان کیے ہیں جو اس کے عمومی نظریے سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس نے استقراری طریقہ مطالعہ کے ذریعے معاشرے میں ٹھوس حقائق کا تجزیہ کیا اور اپنے فلسفیانہ تصورات کی وضاحت کے لیے اس طریقہ کو کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں افلاطون نیکی اور اچھائی کو اصل علم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہماری جستجو دنیا کے سب سے اہم مسئلے یعنی نیک اور بد زندگی سے متعلق ہے۔ اس کے نزدیک مملکت افراد کے مجموعے کا نام ہے اور مملکت بڑے پیمانے پر فرد کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں سب انسان مساوی اور برابر نہیں ہیں اور متذکرہ اصل علم مملکت کے وہی چند افراد حاصل کر سکتے ہیں جنہیں فلسفی کہا جاتا ہے۔ اور جو عقل مندی، دانشمندی اور ذہانت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہوں۔ چونکہ حکمرانی مشکل ترین فنون میں سے ہے لہٰذا حکومت کی باگ ڈور مملکت کے ان دانا اور ذہنی اعتبار سے اعلیٰ ترین افراد جن میں وسیع النظری اور معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہوتی ہے کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔ انہیں لامحدود اختیارات حاصل ہونے چاہئیں لیکن عیش و

عشرت کے لیے مراعات نہیں ملنی چاہیں۔ طبعاً دلیر اور شجاع لوگوں کے ذمہ ملک کی حفاظت ہونی چاہیے کیونکہ وہ بہادری کے لیے ممتاز ہوتے ہیں۔ کاشت کار' دست کار مزدور اور دیگر پیشہ ور لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے فطرتاً زیادہ موزوں ہیں لیکن ان میں حکومت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اگر یہ تینوں طبقے اپنا اپنا کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کریں تو مثالی سماج جنم لے گا اور اس سماج میں انصاف قائم ہوگا۔

اس کتاب میں افلاطون کا سیاسی نظام سماج کے تین طبقوں کے گرد گھومتا ہوا ان کی تین خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دانائی محافظوں یا حکمرانوں کی امتیازی خوبی ہے۔ مملکت میں اتحاد قائم کرنے کے لیے دانائی بہادری اور اعتدال کا ربط ضروری ہے اور اسی ربط کے ذریعے افراد کمال حاصل کرتے ہیں۔ سیاسی نظام عدل کے قیام کے لیے سماج کی تین طبقوں میں تقسیم اس معیار پر ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے کام میں ماہر ہو اور وہ اس کام میں مداخلت نہ کرے جس کی اس میں اہلیت نہ ہو۔

۔اس کتاب میں افلاطون جمہوریت کی بنیاد "تصور" پر رکھتے ہوئے اسے حقائق کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہ مادی علوم کے ساتھ ساتھ سچائی (روح) کی جستجو' فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی کے لیے انصاف کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں مسرتوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ہر شخص سے اہلیت' صلاحیت اور گنجائش کے مطابق کام لینا ضروری ہے۔ وہ اپنے فلسفہ کو انصاف کے اصول پر رکھتے ہوئے عالمی انصاف کے تقاضوں پر اجتماعی فرائض کی پابندی کا درس دیتا ہے۔ اس کے خیال میں "راست عمل" صرف اچھائی کے تصور سے ممکن ہے اور کسی شخص میں بھی خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ اچھائی اور برائی کے جانچنے کا علم بھی موجود ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں مثالی شہری کی زندگی کے حقائق کا مجموعہ سچائی سے بھرپور منظم زندگی ہوتی ہے اور مثالی مملکت میں ہر طرف اچھائی نیکی اور انصاف کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اس کے نزدیک مثالی شہری میں جسمانی حسن' ذہنی بالیدگی حصول علم کی قابلیت و خواہش' ذوق جمال' برائی سے نفرت' ذہنی اختراع' اچھائی کی پہچان' یونانیوں سے محبت' جسمانی توانائی اور حاضر دماغی جیسی صفات موجود ہونی چاہیں۔ وہ معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ حکمران' سپاہی اور مزدور طبقہ۔ اس کی سیاست میں تیسرا طبقہ مجبور و محکوم طبقہ ہے جسے فرائض کی نسبت حقوق بہت کم دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں افلاطون مثالی مملکت کے تین بنیادی اصولوں ''اشتہا'' ''روح'' اور ''عقل سلیم'' کو ریاست اور فرد کی مشابہت سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست میں موجود مزدور' کاشت کار' صنعت کار' کلرک' فنکار یا دیگر کاروباری طبقہ انسانی جسم کے معدہ کی مانند ہے۔ شجاعت سپاہیوں کا طرہ امتیاز ہے جبکہ ''اعتدال'' تینوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ وہ انسانی سیرت کی فطری صلاحیتوں کی بنیاد پر ''جسمانی یا نفسانی خواہشات'' ''ہمت و شجاعت'' اور ''دانائی و عقل مندی جیسے تین قدرتی اوصاف میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سماج میں مختلف طبقوں کی خاص صفتوں کے لحاظ سے جو تقسیم کی گئی ہے اسے اگر سیرت انسانی سے تشبیہہ دی جائے تو کاشت کار دست کار اور دوسرے پیشہ ور لوگ جسمانی یا نفسانی خواہشات' سپاہی ہمت اور بہادری جبکہ فلسفی اور محافظ دانائی کے مظہر ہیں اور یہ تقسیم فطری صلاحیتوں کے عین مطابق ہے۔ اس کے لیے وہ نچلے طبقے کی ذہنی تربیت اس عقیدے کے ذریعے کرنے پر زور دیتا ہے کہ خدا نے فلسفیوں اور محافظوں کو سونے سے' سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے۔ لہٰذا نچلے طبقے پر لازم ہے کہ وہ دونوں برتر طبقوں کی جو انسانیت کے بہترین عناصر ہیں کی پوری اطاعت کرے۔ وہ دراصل طبقوں کی حکومت کے ذریعے سچائی نیکی کا بول بالا اور انسانی سیرت کی اعلیٰ ترین حیثیت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی مثالی مملکت سیاسی رنگ سے زیادہ

مذہبی اور اخلاقی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اصول اور نظریوں میں حکمرانوں کے طور طریقوں اور عقیدوں کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ روحانیت کا پرچار ہو سکے۔

اس کتاب میں افلاطون اپنے سیاسی نظام میں ہم آہنگی، اخلاقی و سماجی قوانین کی پیروی اور فرائض کی ادائیگی کو عدل کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مملکت کا دستور جس قدر گرا ہوا ہوگا مملکت کے شہری اسی نسبت سے سچی خوشی، حقیقی مسرت اور سکون سے دور ہوں گے وہ سیاسی نظام کی پختگی کے لیے عدل کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ عدل اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہر شخص کا تعلق اپنی فطری صلاحیت اور استعداد کے مطابق کسی نہ کسی طبقے سے ہو۔ وہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ زیادہ قدرت رکھنے والے قانون کو اپنے مفادات کو مد نظر رکھ کر بناتے ہیں اور خود پرست انسان دنیا میں گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک سیاسی عدل کی اصل غرض ہر طبقے کے تمام افراد کو ان کاموں میں مصروف رکھنا ہے جن کے لیے وہ فطری مناسبت اور صلاحیت کی بنا پر موزوں ہیں۔

اس کتاب میں سپاہیوں کو گھریلو مسرت، ذاتی اور نجی ملکیت سے دور رکھتے ہوئے نچلے طبقے پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اس طبقہ کی ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ محافظوں کی ذاتی اور نجی جائیداد بلکہ کسی چیز پر قبضہ یا ملکیت کی ممانعت دراصل معاشی مسائل کو حل کرتا تھا۔

افلاطون نے الجمہوریہ میں محافظ اور سپاہی عورتوں کے بچوں کی تربیت مملکت کی ذمہ داری قرار دی اور ان کی معاشی زندگی کے لیے اصول اشتمالیت تجویز کیا۔ جس میں سپاہیوں اور محافظوں کو جسمانی اور ذہنی خوبیوں کے حامل مردوں اور عورتوں سے عارضی نکاح کرنے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ شہوانی خواہشات پوری کر سکیں۔ خود غرض عورتوں کی محکومیت سیاسی زندگی کے استحکام اور محافظوں اور سپاہیوں کے طبقے کو ایک بڑے خاندان کی حیثیت دینے کے لیے اس نے تجویز کیا کہ پیدائش کے بعد بچے کو

ماں سے جدا کر دیا جائے تا کہ ماں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا بچہ کون سا ہے۔ اس لاعلمی سے وہ تمام بچے جن کی پیدائش ایک وقت میں ہو گی اس کی ممتا کے مستحق اور حقدار ہوں گے۔

افلاطون نے الجمہوریہ میں شہری ریاست کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا واحد کارنامہ تھا جس میں اس نے تمام مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پیش کردہ مثالی ریاست میں درج ذیل نکات زیادہ اہم ہیں۔

(۱) بادشاہت

(۲) اشرافیہ

(۳) جمہوریت

حکومت کا حق صرف اور صرف فلاسفر کنگ کے لیے تفویض کیا گیا اور مثالی ریاست کی بنیاد انصاف پر رکھی گئی جس میں اس نے معاشرے کو درج ذیل تین حصوں میں کلاسفائیڈ کیا۔

(۱) حکمران طبقہ

(۲) فوجی طبقہ

(۳) مزدور اور دیگر پیشہ ور طبقہ

اس کی ریاست میں نچلہ طبقہ اشتہا سے مشابہت رکھتا ہے۔ ریاست کا سپاہی انسانی قلب کی مانند ہے جسے روح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فلسفی یا حکمران انسانی دماغ کی مانند ہے جو عقل سلیم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک فرد میں وہ تمام خواص چھوٹے پیمانے پر موجود ہوتے ہیں جن کا بڑے پیمانے پر ایک معاشرہ حامل ہوتا ہے۔ دونوں میں اشتہا، روح اور عقل سلیم کے عناصر مشترک ہیں اور اس اعتبار سے معاشرہ نہ صرف ایک فرد کے پھیلاؤ کا نام ہے بلکہ ایک فرد ریاست کا اختصار بھی ہے۔

افلاطون کی مثالی ریاست تین عناصر نظام اشتراک، عمل و اشتراک املاک

نظام تعلیم اور فلسفہ کی حاکیت پر مشتمل ہے۔اس کے خیال میں حکمرانوں اور سپاہیوں کے پاس نجی املاک نہیں ہونی چاہیے اور صرف املاک اور کنبہ کے بارے میں اشتراکیت کا نظام مناسب حالات پیدا کر سکتا ہے۔ تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور اس پر فلسفیانہ ضابطوں کے تحت کنٹرول ضروری ہے۔ تعلیم روح کی پیدائش اور اس کی نشوونما کا نام ہے اس لیے نظام تعلیم کو مکمل طور پر ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ فلسفیوں میں فہم وادراک، عقل سلیم اور وجدان موجود ہوتے ہیں' ان کا عمل راست عمل ہوتا ہے' وہ ہر وقت سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لہٰذا انہیں حکمران ہونا چاہیے ۔انہیں دنیاوی خواہشات اور اقتصادی مشکلات سے آزاد ہونا چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں اقتدار 50 سے 70 سالہ عمر کے 37 منتخب عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ جن کے ذمہ قانون سازی کے علاوہ سرکاری شعبوں کی نگرانی بھی ہو گی۔اس 37 رکنی جماعت کی مدد 360 رکنی جماعت کرے گی جن کے ذمہ برسراقتدار جماعت کے احکامات پر عمل درآمد اور ان کا نفاذ ہو گا۔اس کے علاوہ اشراف مرد اور عورتوں پر مشتمل جیوری ہو گی۔ایک دس رکنی جماعت مقننہ کی مدد کرے گی اس کے علاوہ بیس پادریوں پر مشتمل جماعت بیس اور نوجوانوں کی مدد سے پروپیگنڈا کے علاوہ فرسودہ خیالات اور توہمات کو ختم کر کے نئی روشنی کا درس دے گی۔

الجمہوریہ میں مثالی مملکت میں کاشت کار اور دست کار کو تعلیم اور علم سے محروم رکھا گیا ہے۔ تبدیلیوں اور ترامیم کر کے مثالی ریاست کے نظام تعلیم کو بھی تین حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) درجہ اول جس میں پیدائش سے لے کر چھ سال کی عمر کے بچوں کو ان کی لیاؤں کے ذریعے مثبت اور اخلاقی کہانیوں' کہاوتوں اور قصوں سے تربیت کی سفارش کی گئی ہے۔

(۲) درجہ دوئم جس میں چھ سے اٹھارہ سال تک صرف جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا ضروری قرار دی گئی کیونکہ افلاطون جمناسٹک کو صحت مند ذہنی تربیت کے لیے اور موسیقی کو جذباتی صحت کے لیے لازمی قرار دیتا تھا جس کے بعد وہ ان کے امتحان کی سفارش کرتا ہے اور فیل ہو جانے والوں کو وہ تیسرے طبقے میں رکھنے کی سفارش کرتا ہے اس کے بعد دو سال تک فوجی تربیت لازمی قرار دیتا ہے اور دو سال بعد امتحان میں کامیاب ہونے والے اشخاص کو فوجی طبقہ میں شامل کرنے کی سفارش کرتا ہے۔

(۳) درجہ سوئم جس میں 20 سے 35 سال تک وہ ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم کے لئے سفارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 35 سال کی عمر تک ہونے والے تمام امتحانات میں کامیاب ہونے والے شخص کو حکمران بننے کا حق ہوگا البتہ مزید 15 سال تک جو عملی سیاست کی تربیت حاصل کرے گا وہ فلاسفر کنگ ہوگا جس کو حکومت کے لئے سب پر ترجیح دی جائے گی۔

افلاطون کے خیال میں تعلیم و تدریس کا مقصد انسانی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرانا تھا جس کے تحت اس کی بالیدگی یا ریفارمیشن ممکن ہو اس کا خیال تھا کہ "جس طرح جسم انسانی کے لیے خوراک ضروری ہے بالکل ویسے ہی روح کی بالیدگی کے لیے تعلیم اہم ہے اس کے نزدیک مقصد حیات عدل کی تکمیل ہے اور تعلیم عدل کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب تک افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک عدل کی تکمیل ممکن نہیں ہے اور اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے مثالی ریاست "Ideal state" کا نظریہ پیش کیا جس کا مقصد لوگوں کے عام کردار کو بلند کرنا اور ان میں تعلیمی رجحان کا فروغ تھا۔

اس زمانے میں تعلیم کا حصول بالکل ذاتی مسئلہ تھا اور صرف مخصوص اور بااثر افراد کے لڑکے ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے جبکہ لڑکیوں میں تو اول تعلیم نام کو بھی نہ

تھی اور اگر چند ایک گھرانوں کی لڑکیاں اس قسم کی جرات کا مظاہرہ کرتیں تو انہیں صرف مخصوص قسم کے مضامین ہی پڑھائے جاتے تھے جن کا تعلق گھریلو زندگی سے ہوتا تھا افلاطون اس سسٹم کے خلاف تھا اور چاہتا تھا کہ لڑکیاں بھی چار دیواری سے باہر نکلیں اور دوسرے تمام مضامین پر تعلیم حاصل کریں وہ تعلیم کو عورت کا حق سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "کتا ہمارا بہترین دوست ہے اگر وہ چوکیداری کر سکتا ہے تو کیا ایک کتیا یہ کام نہیں کر سکتی یہ درست ہے کہ عورت مرد سے جسمانی طور پر کمزور ہے لیکن اتنی کمزور بھی نہیں کہ اسے تمام حقوق سے محروم کر کے محض بچے جننے یا پیدا کرنے کی مشین سمجھ کر گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا جائے"۔

افلاطون نے مثالی مملکت کی بنیاد اخلاق اور مذہب پر رکھی۔ قرون وسطیٰ کے ادارے افلاطون کی تصانیف "ریاست" اور "قانون" کی تعلیم سے نہ صرف متشابہ ہیں بلکہ ان کے مذہبی اور معاشی نظام میں طبقوں کی وہی تقسیم موجود ہے جو افلاطون نے سیاسی نظام میں پیش کی تھی۔

الجمہوریہ ایک جامع ہے۔ ایک کعبہ اور چرچ ہے۔ دراصل ایک عالم کے دل کی ابدی آواز ہے۔ ایک دانش ور کے یقین کا اظہار ہے۔ جو علم اور بصیرت میں ایسی قوتیں کار فرما دیکھتا ہے جن پر معاشرتی ترقی کا انحصار ہے۔ ارسطو اس کتاب کو اخلاقیات پر الہامی کتاب کا درجہ دیتا ہے۔ آگسٹائن کی نظر میں یہ کتاب علم سیاسیات پر مستند اور جامع کتاب ہے۔ روسو اس کتاب کو تعلیم کے حوالہ سے سب سے بہتر کتاب تسلیم کرتا ہے جبکہ گرین نیسانکٹ اور دیگر عینیت پسند مفکر اس تصنیف سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر سبائن کہتا ہے کہ افلاطون کی اس تصنیف کو کسی ایک موضوع سے منسلک کرنا اس کتاب کی علمی حیثیت کی توہین ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اخلاقیات، سیاسیات، نظام تعلیم، نفسیات، معاشیات، مابعد الطبعیات، ترویج و ترتیب، فلسفی حکمران اور مذہب سے متعلق تصورات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے اس کتاب کو سیاسیات پر ایک اہم

اور مستند کتاب قرار دیا ہے۔ تاریخ سیاسیات میں افلاطون کی مثالی مملکت کی تقلید سسرو' سینٹ آگسٹائن اور سر تامس مور نے اپنی مثالی مملکتوں کے خاکوں میں اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد روسو اور ہیگل نے یورپین سیاسی فلسفہ میں کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں نظام تعلیم کے جو تصورات پیش کیے تھے مختلف ادوار میں مختلف اقوام بالخصوص یورپی ممالک کے لیے سنگ میل ثابت ہوئے ہیں اور آج بھی مختلف ممالک میں حالات و ماحول کے مطابق ترمیم و اضافہ کے ساتھ رائج ہیں۔ روسو کہتا ہے کہ الجمہوریہ جیسی عظیم کتاب نظام تعلیم پر نہ اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ اس کے بعد لکھی جائے گی۔ جیورٹ کے مطابق الجمہوریہ ایک یونیورسٹی ہے۔ جان لاک لکھتا ہے کہ افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں جو تعلیمی تصورات پیش کیے ہیں یہ تصورات ایک باضابطہ نظام تعلیم کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ ابن خلدون کے مطابق الجمہوریہ کے تعلیمی تصورات یورپی ممالک کے نظام ہائے تعلیم کی فلسفیانہ اساس ہے۔

پروفیسر سیبائن کہتا ہے کہ الجمہوریہ نظام تعلیم پر دنیا کی پہلی مستند کتاب ہے۔

10۔ گورجیس یا گورگیاس (Gorgias) اس کتاب میں عملی سیاست دان' طاقت ور کے حقوق' ہر قیمت پر عدل اور فلسفی کی اہمیت و حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گورجیس بظاہر خطابت پردازی کے حسن و قبح کے بارے میں ہے لیکن بعد میں بحث کا مرکز اخلاقیات بن جاتا ہے۔ اس کتاب میں افلاطون سقراط کی زبان میں ثابت کرتا ہے کہ حق پژوہی اور حق پر عمل درآمد ہی انسان کا بنیادی مقصد ہے اور خطابت پردازی ناقص اور گمراہ کن فن ہے۔ سقراط کلی کلیس سے بالآخر منواتا ہے کہ بعض فنون جھوٹے اور بعض سچے ہوتے ہیں اور اس طرح لذتیں جھوٹی سچی یا اچھی بری ہوتی ہیں۔ سقراط کے مطابق سیاستدان کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اخلاقی اقدار سے باخبر ہو اور قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے۔ آخر میں سقراط نے ایک اسطورے کی مدد سے عالم آخرت میں جزا و سزا پر روشنی ڈالی ہے۔

11۔ مینو(Meno) یہ کتاب فضیلت کی تعلیم کے بارے میں ہے اور اس امر کو نظریہ امثال سے واضح کیا گیا ہے۔ مینو میں پروٹاگورس کی بحث جاری ہے اور اس اہم مسئلہ پر بحث ہوتی ہے کہ ایسے استاد کہاں سے بہم پہنچائے جائیں جو نیکی کی تعلیم دے سکیں اور اس کی کیا وجہ ہے کہ سیاستدان جو دوسروں کو راہ دکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود اپنی اولاد کو کچھ نہیں سکھا سکتے۔ سقراط کے خیال میں علم تذکار کا دوسرا نام ہے۔ ہماری روحوں نے بار بار جنم لیا ہے اور یہ روحیں دونوں جہانوں کی ہر بات سے واقف ہیں۔ یہ وقوف روحوں میں موجود تو ہے مگر گہنا گیا ہے۔ تعلیم وتربیت کا کام اتنا ہے کہ اس خوابیدہ وقوف کو جگادے۔ ان تمام موشگافیوں کے باوجود اس کتاب کے آخر تک یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ نیکی کس طرح سکھائی جا سکتی ہے اور سقراط یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آسمانی توفیق شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

12۔ یوتھیڈیمس(Euthydemus) یہ مکالمہ بعد میں آنے والے سوفسطائیوں کے متعلق مغالطوں کے بارے میں ہے۔

13۔ ہیپس(Hyppias) "حصہ اول"۔ حسن کے بارے میں ہے۔

14۔ ہیپس(Hyppias) "حصہ دوم" اس میں اس مسئلہ پر تحقیق وبحث کی گئی ہے کہ ارادتاً برا کام کرنا بہتر ہے یا غیر ارادی طور۔

15۔ کریٹی لس(Cratylus) یہ کتاب نظریہ لسان سے متعلق ہے۔

یہ اشتقاق اور لسانیات کے بارے میں آب وتاب سے پر اور قدرے ظریفانہ مباحث ہے۔ زبان کے فلسفے کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لفظوں کا چیزوں سے کیا رشتہ ہے۔ بحث اس بات پر ختم کی جاتی ہے کہ لفظوں کو براہ راست اشیاء کی ماہیت سے مشتق سمجھنا بہت مشکوک ہے لہٰذا لفظوں کی مدد سے اشیاء کی ماہیت کو سمجھنا بھی ناممکن ہے۔ پھر اشتقاق پر تمسخر آمیز گفتگو کے ساتھ ساتھ تاریخ اور فلسفے کے اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔

16۔ مینکسی نس(Menexenus) اس کتاب میں خطابت کے نقائص بیان کیے گئے ہیں۔
اصل مضمون یہ ہے کہ تمام دنیاوی حسن حسن حقیقی کے باعث ہے۔ یہ کتاب افلاطون کا عظیم ترین ادبی شاہکار ہے افسانوی رنگ سے سجی سجائی اس روداد میں افلاطون کی قوت ایجاد تمام بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ پس منظر میں اگاتھون نامی المیہ ڈرامہ نگار کے گھر پر ہونے والی ضیافت میں سقراط شامل ہے اور جملہ حاضرین خود کو عشق کی ثناخوانی کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ پاؤسانیاس کے مطابق عشق دو طرح کا ہوتا ہے اعلیٰ تر اور ادنیٰ تر۔ ادنیٰ صورت میں مردوں اور عورتوں سے دل لگایا جاتا تھا اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے سوا کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ اعلیٰ تر عشق نوجوانوں سے ہوتا ہے تاکہ ان کی رفاقت میں اعلیٰ اقدار کو پوری طرح اپنانے کا موقعہ ملے۔ اس کے بعد اریوکسی ماخوس نے اس موضوع کا پیشہ ورانہ اور تکنیکی زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔
مشہور طربیہ نگار ارستوفانیس نے دعویٰ کیا کہ انسان اصل میں مکمل تھے اور ان کی تین جنسیں تھیں۔ مرد' عورت اور مخنث۔ زیوس دیوتا نے ناراض ہو کر انہیں دو نیم کر دیا۔ تب سے وہ دن رات اپنے نصف باقی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ عشق گویا اپنی تکمیل کی خواہش اور جستجو ہے۔ مرد عورت خواہاں ہیں کہ کسی طرح وہی حسین دور وصال لوٹ آئے۔ ارستوفانیس تسلیم کرتا ہے کہ عشق ایک ضرورت ہے اور ضرورت بھی ایسی جس میں جسمانی تقاضوں سے ماورا ابھی بہت کچھ شامل ہے۔ عشق راحت گم گشتہ دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ہے۔
اس کے بعد اگاتھون کی تقریر ہے جو خطابت پردازی کا عمدہ نمونہ ہے جسے سقراط ارستوفانیس کے نظریات کے مقابلے میں ہیچ قرار دیتا ہے۔ آخر میں سقراط دیوتیما نامی فرضی کردار کے ذریعے اپنی گفتگو کرتا ہے۔ دیوتیما سقراط کو سمجھاتی ہے کہ عشق حیاتی اور ابدی دنیا کے مابین رابطوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ وسیع پیمانے پر تمام لوگ اچھائی سے عشق کرتے ہیں لیکن عام طور پر اس سے جنسی لگاؤ ہی مراد ہوتا ہے۔ لیکن عشق کے اس

تماش کے دوام کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ توالد و تناسل کا سہارا لیا جائے۔ دیوتما کے کہنے کے مطابق روحانی توالد کہیں افضل ہے۔ روحانی توالد سے روح کی وہ سرگرمی مراد ہے جس کی برکت سے نہ صرف تمام فنون جنم لیتے ہیں بلکہ تمدنی ارتقا سے معاشرہ نظم و ضبط سے متعارف ہوتا ہے۔ حقیقی عاشق وہی ہے جو فلسفی ہو اور حیات کی دنیا سے بلند ہو کر جی سکے۔ ان روحانی صعود کے مراحل میں پہلے کسی فرد کی ظاہری خوبصورتی سے پھر اس کے جسمانی حسن سے اور آخر میں روح کے جمال سے عشق کیا جائے گویا یہ سفر مجاز سے حقیقت کی طرف ہے۔ دیوتما نے جو اصلاحیں برتی ہیں ان کا رشتہ اسراری مذاہب سے ہے اور صعود کے یہ مراحل اسرار آشنائی کے مراحل سے مشابہ ہے۔

سقراط کی تقریر کے بعد نشے میں چور الکی بیادیس آ دھمکتا ہے اور سقراط کی تقریر کو شجاعت اور دانش کا پیکر قرار دیتا ہے۔ الکی بیادیس کو سقراط کی ذات 'بلند خیالی' انکسار' روحانیت اور دیوتاؤں جیسی دلربائی کا شستہ امتزاج نظر آتی ہے۔ اس طرح مجازی سطح پر تو الکی بیادیس معشوق اور سقراط عاشق ہے لیکن روحانی سطح پر ان کے کردار الٹ جاتے ہیں۔ الکی بیادیس یہ بتانے سے قاصر رہتا ہے کہ سقراط میں وہ کیا خوبی ہے جو اس کے دل کو کھینچتی ہے۔ دیوتما کے حوالے سے وہ سقراط کی روح کے جمال پر فریفتہ تھا۔

18۔ فیڈو (Phaedo) اس کتاب میں امثال اور بقائے دوام کے نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ فیڈو میں سقراط کی زندگی کے آخری دن کا ذکر ہے۔ اس روز سقراط کے کئی قریبی دوست قید خانے میں موجود تھے اس کی دکھیاری بیوی اور تینوں کمسن لڑکے بھی ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے لیکن سقراط نے انہیں جلدی رخصت کر دیا تاکہ آہ و زاری مردوں کی گفتگو میں خلل نہ ڈالے اور موت کی بات چھڑی تو سقراط نے دعویٰ کیا کہ جو آدمی صحیح معنوں میں فلسفی ہوتا ہے اسے موت کی دہشت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ اگلی زندگی پر گفتگو کرتے ہوئے اس یقین کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے کہ انسانی روح لافانی ہے۔

زندگی کا سرچشمہ روح ہے موت اور زندگی کی طرح موت اور روح بھی متبائن ہیں۔اس طرح روح کے لبدی ہونے میں کلام نہیں۔ ہم مجرد اور لبدی معاملات کا جو علم رکھتے ہیں وہ سب روح کی دین ہے۔اس کے بعد دوست غم سے نڈھال اور سقراط مسرور نظر آتا ہے پھر وہ یہ کہتے ہوئے زہر پی لیتا ہے کہ شفا کے دیوتا اسکلے پیوس کو ایک مرغا بھینٹ دیا جائے یہ بھینٹ بیمار لوگ شفایابی کی امید یا شفایاب ہونے پر دیتے تھے۔اس طرح سقراط نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا کہ اس عارضے کا جسے ہم زندگی کا نام دیتے ہیں کا علاج موت ہے۔

19۔فارڈس یا فائیڈروس(Phaedrus) یہ کتاب محبت کی نوعیت کے متعلق ہے۔ فائیڈروس در حقیقت گورگیاس اور منادمہ کے مباحث کو نئی آب و تاب کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے اس مکالمے میں افلاطونی فکر کے بہت سارے اہم پہلو ہیں جن کی تلخیص ممکن نہیں۔اس کتاب میں خطابت پردازی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ فن بھی علمی یا فلسفیانہ متانت کا حاصل ہو سکتا ہے۔سقراط نے عشق کو روحانی قوت قرار دیتے ہوئے کہا کہ انسانی روح ایسے رتھ کی مانند ہے جس میں دو ایسے گھوڑے جتے ہوں جس میں ایک روحانی اور دوسرا اشائستہ ہو۔ منطقی اور علوی کشاکش میں مبتلا روح کو اگر عشق کی رہنمائی نصیب ہو جائے تو وہ اس عالم غیب کی سیر کر سکتی ہے جو ماورائی حقیقتوں کا امین ہے۔یہی نہیں بلکہ عشق سے سرشار انسان عالم ناسوت میں بھی بہت سے عالی ظرفانہ کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔عشق دیوتاؤں کی دین ہے جو انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔

20۔تھیاٹیٹس(Theaetetus) سوفسطائیہ کے اس نظریہ کی حفاظت کہ "علم حسی ادراک ہے" اس کتاب کا موضوع علمیات ہے۔بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ شرطیں کون سی ہیں جنہیں پورا کر کے علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔افلاطون کے خیال میں علم کی بنیاد احساس ہے نہ کہ ذہن۔احساس کی حقیقت خود اپنے تک محدود ہے اور خیالات الفاظ کا الٹ پھیر ہیں۔لہٰذا صرف دل و دماغ پر تکیہ کرنے سے علم کا حصول ممکن نہیں۔اس مکالمہ کا

امتیازی پہلو عبارت کی رعنائی اور خوش قماشی ہے۔

21۔پارمینڈیز(Parmanides) اس کتاب میں نظریہ امثال پر کی جانے والی تنقید کا جواب دیا گیا ہے۔اس کتاب میں مشہور فلسفیوں پارمینڈیز' زینو اور سقراط کی افسانوی ملاقات اور ان میں ہونے والی گفتگو کو رقم کیا گیا ہے۔ گفتگو میں سقراط کی حیثیت زیادہ تر سامعہ کی ہے۔ پہلے پارمینڈیز کی مثالی نمونوں پر تنقید ہے اس کے بعد آٹھ ایسے مابعد الطبعیاتی مقدمات کا سلسلہ ہے جو اعتراضات کی تاب نہیں لا سکتے خود اپنی تغلیط ہیں اور انجام کار چیستانوں میں بدل جاتے ہیں۔یہ مکالمہ جس کا آخری نصف لفظی اور ذہنی دراکی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے خوب اوق ہے۔پارمینڈیز کی یہ تنقید ایک نادر مثال ہے۔

22۔سوفسطائیہ(Sophistes) اس کتاب میں نظریہ امثال کا دوبارہ بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

23۔پولیٹکس(Politicus) حکمران فلسفی ہونا چاہیے۔کسی ریاست کا نصب العین مثالی ریاست ہونا چاہیے اس کتاب کے موضوعات ہیں۔

افلاطون کی دوسری سیاسی فلسفہ پر مبنی اس کتاب میں مدبر کی صفات بیان کی گئی ہیں جو کم وبیش وہی ہیں جو جمہوریہ میں فلسفی یا محافظ کے بیان میں بیان کی گئی ہیں۔یہ کتاب افلاطون نے اپنے آخری ایام میں 360 ق م میں لکھی۔اس کتاب کا مقصد حکمران کا مثالی تصور پیدا کرنا اور سیاسیات کو علم کے میدان میں مناسب جگہ دینا ہے یہ کتاب "قوانین" سے چند سال پہلے لکھی گئی تھی بارکر کے مطابق اس کتاب میں قانون کے بارے میں ایک نیا نظریہ پیش کیا گیا ہے جو بظاہر قانون کے خلاف ہے اور یہی دونوں اوصاف اس کتاب کا حسن ہے۔

اس کتاب میں افلاطون کے نزدیک "مدبر" تمام علوم کا حامل اور قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔وہ ماتحتوں پر جبر کرنے کا حق رکھتا ہے۔لیکن وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ مدبر محض قانون بنانے والا ہوتا ہے اور اس سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان

مملکتوں میں جہاں محافظ اور فلسفی موجود نہ ہوں وہاں قانون کی حکومت ہونی چاہیے۔ افلاطون نجی املاک کے خلاف تھا اور خاندان پرستی کی سخت ممانعت کرتا تھا وہ نجی املاک کا حق صرف تیسرے طبقے کو دیتا تھا اور اس کی خیالی مملکت میں بیویاں رکھنے کا حق بھی صرف اسی کے لیے محفوظ تھا۔

افلاطون کے نزدیک نظام تعلیم اصل مقصد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ خیر یا نیکی کا حصول تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مثالی مملکت انسانی ذہن کی مظہر اور انصاف انسانی ذہن کی صفت ہے لہٰذا انسان کی تربیت اعلیٰ پیرائے پر ہونی چاہیے اور اس مقصد کے لیے بہترین طریقہ تعلیم ہے۔

افلاطون کے نزدیک مملکت کو چاہیے کہ وہ اپنی زیر نگرانی طبقاتی اور مخلوط نظام تعلیم جبری طور پر جاری کرے اور مختلف مدارج کے لیے الگ الگ نصاب کا تعین کرے۔ سات سال تک کی ابتدائی تعلیم میں بچوں کو اعلیٰ اخلاقیات کی حامل کہانیاں سنائی جائیں۔ اٹھارہ سال تک ثانوی تعلیم میں جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم دی جائے تاکہ صحت مند جسم اور صحت مند دماغ ایک ساتھ پرورش پا سکیں۔ ثانوی تعلیم میں صرف کامیاب بچوں کو مزید دو سال تک تعلیم دی جائے اور ناکام بچوں کو نچلی سطح کے فرائض سونپے جائیں۔ دو سالہ تعلیم میں ریاضی اور عملی تربیت پر زور دیا جائے۔ بیس سال کی عمر میں امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو مزید تعلیم دی جائے۔ جبکہ ناکام بچوں کو فوجی فرائض سونپے جائیں۔ 20 سے 35 سال کی تعلیم کے دوران طلباء کو علم ریاضی علم طب، علم نجوم، مابعد الطبعیات اور فلسفہ پڑھایا جائے اور 35 سال کی عمر میں کامیاب ہونے والوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے منتخب کیا جائے اور ناکام ہونے والوں کو وکیل مجسٹریٹ اور حکومت کے دیگر انتظامی عہدوں پر فائز کیا جائے 35 سالہ تعلیم کے حصول کے بعد کامیاب ہونے والوں کو فلسفہ اور منطق پڑھایا جائے۔ یہ لوگ پچاس سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہیں گے اور فلسفی کہلائیں گے اور یہی لوگ عنان حکومت سنبھالنے

کے قابل ہوں گے۔ اس کے خیال میں فلسفی ہی حقیقت اور سچائی کی پہچان بن سکتے ہیں اور انصاف کے ذریعے مثالی مملکت قائم کر سکتے ہیں۔

"مدبر" میں قانون کو سیاسی زندگی میں ضروری اور "قانون" میں قانون کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قوانین فطری ہوتے ہیں اور فطرت سے لڑنا آسان نہیں ہے اس لیے ہر شخص قانون کی بالادستی تسلیم کر کے ہی اپنی زندگی میں تسلسل برقرار رکھ سکتا ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ "جب تک قدرت یا تو مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو دانا اور ایماندار یعنی فلسفی بنا دے یا پھر دانا اور ایماندار فلسفیوں کو ریاستوں کا حکمران بننے کا موقع عطا کر دے اور جب تک ان دو میں کوئی ایک کام نہیں ہوگا ریاست کی سماجی زندگی اور اقتصادی وسیاسی حالات کبھی درست نہیں ہونگے۔

افلاطون کے نزدیک مدبر ربط اور مقصدیت پیدا کر کے افراد اور سماج کو مملکت بنا سکتا ہے۔ اس کتاب میں عدل کی جگہ اعتدال اور دستور اور حقیقی علم کی بجائے ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کو سیاسی زندگی کا اصول قرار دیا گیا ہے۔

24۔ فلی بس (Philebus) اس کتاب میں لذت اور خیر کے تعلق کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا مقالہ ہے جس کے ذریعے عقلی اور منطقی تدبر کی قوت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں زیادہ تر منطقی بحث ہے اس لیے اصل موضوع یعنی سیاستدان کا کردار اور مقام کتاب کے آخر میں موضوع بحث آیا ہے جس میں تھیوری اور پریکٹس کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے سیاستدان کے لیے عملی سیاست کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے علم کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک Politics کی بنیاد Politics Science ہے اور تھیوری عقل اور منطق پر مبنی علم ہے۔

افلاطون کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں۔ تنقیدی علم اور حکم دینے والا علم۔ تنقیدی علم کا کام معاملات کا تنقیدی جائزہ لینا جبکہ حکم دینے والے علم کا کام غور وفکر

کے بعد حکم صادر کرتا ہے۔وہ حکم دینے والے علم کو مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے تجزیہ پیش کرتا ہے کہ پہلی قسم جو حکم دیتی ہے وہ مقتدر اعلی ہے دوسری قسم اپنے سے برتر ہستی کے احکامات کی بجا آوری کے لیے نچلے درجے کی نوع کو حکم دیتی ہے اور سیاستدان اول درجہ کی نوع سے تعلق رکھتا ہے اور وہی اعلی درجہ علم کا حکم دینے والا ہوتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک علم سیاسیات ایک ایسی سائنس ہے جو ان تمام دوسری سائنسوں سے اعلی اور برتر ہے جن کا تعلق عمل سے ہے۔یہ سائنس دراصل ریاست کی حکومت کو درست خطوط پر چلانے کی سائنس ہے اور سیاستدان ایک گڈریے کی مانند ہے جو اپنے سارے ریوڑ کا رکھوالا ہوتا ہے۔اس کے تمام احکامات انسانوں کی اجتماعی بہتری کے لیے ہوتے ہیں۔لیکن آخر میں وہ اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک فرضی دیو مالائی قصہ کا سہارا لیتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک آئین کی تین قسمیں ہیں۔پہلی قسم ایک ایسے آئین کی ہے جس کی رو سے ایک سربراہ یا مقتدر اعلی ہو۔دوسری قسم میں یہ فرض کچھ لوگ مل کر ادا کرتے ہیں اور تیسری قسم میں بہت سے لوگ مل کر یہ فرض ادا کرتے ہیں۔افلاطون کے خیال میں آئین کے تین اور میعار بھی ہیں۔

۱)۔دولت اور غربت کی موجودگی

۲)۔قانون کی موجودگی یا غیر موجودگی

۳)۔عوام کی اطاعت بذریعہ جبر یا رضاکارانہ

ان تین قسموں میں سے پہلی دو قسموں سے ہر قسم کو دو مزید قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱)۔قانونی بادشاہت اور غیر قانونی آمریت

۲)۔اشرافیہ یا چند سری

لیکن ان قسموں میں سے کوئی قسم بھی ایک حقیقی ریاست کے وجود کی لازمی شرط نہیں۔

افلاطون کے نزدیک اگر حکمران حقیقی ہے تو معاشرے کے لوگوں کے تمام طبقات خوشحال اور مطمئن ہونگے اور حکومت کا ہر شعبہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے کام سر انجام دے گا۔ پولیٹیکل سائنس کا علم ہی ایک سیاسی راہنما کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ریاست کی صحیح قانونی اور اخلاقی حکومت وہی ہے جو اس علم کی بنیاد پر فرائض سر انجام دیتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سیاسی فلسفہ کا علم یا تو ایک خاص فرد حاصل کر سکتا ہے یا چند ایک بہتر صلاحیت والے لوگ۔ سارا معاشرہ اس علم کو پوری طرح نہ سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ یقیناً اس دور کی صدارتی اور پارلیمانی سیاسی نظاموں کی ابتدائی صورت ہے۔

افلاطون کے مطابق ایک نقلی سربراہ یا سیاستدان عوامی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی مفاد یا اپنے ساتھیوں کے مفاد کے لیے قانون بناتا اور نافذ کرتا ہے جس سے عوام کو نقصان پہنچتا ہے اور عوام ان قوانین اور ضابطوں کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ حقیقی حکمران عوام کی خوشحالی اور اجتماعی مفاد کے لیئے قوانین اور ضابطے بناتے ہیں جن سے عوام کی سماجی زندگی میں سکھ آتا ہے اور عوام اپنے اس حکمران کا ساتھ دیتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ایک حقیقی سربراہ کے لیے عوام کی رضامندی کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور اسی طرح ایک عالم فاضل اور ماہر قانون سیاسی حکمران کو ریاست کا کاروبار چلانے کے لیے پہلے سے طے شدہ یا تحریر شدہ کسی ضابطہ یا قانون کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تازہ ترین احکامات کے ذریعے حکومت چلا سکتا ہے۔ اس کا ہر ایک حکم ایک ضابطہ اور قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک قانون امیر غریب کمزور یا طاقتور کے فرق کو نہیں دیکھتا حالات اور موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھتا اس لیے حالات کو بہتر بنانے اور مسائل کو سلجھانے کے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک ایک حقیقی حکمران فنکار کی مانند ہے جو اپنے فنکارانہ ذہن سے اور فنکارانہ عمل سے آئین و قانون اور ریاست کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ریاست کی تخلیق کا بنیادی مقصد معاشرے کے مختلف طبقات میں سماجی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور یہ کام صحیح طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب فنکار اپنی سوچ اور عمل میں آزاد ہو۔

افلاطون کے نزدیک تعلیم دو حصوں پر مشتمل ہے ذہنی تعلیم اور جسمانی تعلیم و تربیت۔ ابتدائی تعلیم جو بنیادی طور پر اخلاقی تعلیم ہے اور جس میں نیکی اور بدی کی وضاحت ہے سب شہریوں کے لیے یکساں طور پر لازمی ہے جس کے بعد ذہنی و جسمانی صلاحیت کے مطابق ہر شخص تعلیمی مراحل طے کرتا ہے۔ تعلیمی نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، ریاضی اور آخر میں فلسفہ شامل ہے۔ ہر شخص اپنی فطری ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرتا ہے اور ایک خاص مقام تک پہنچ پاتا ہے۔ تعلیم کا انتظام ریاست کی طرف سے مفت ہے اور ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔

افلاطون کے نزدیک اعلیٰ ذہنی و جسمانی صلاحیت کے حامل مردوں اور عورتوں میں شادی ہونی چاہیے جن کی اپنی الگ الگ صلاحیت اور فیلڈ ہو تاکہ اولاد میں ماں باپ دونوں کی اعلیٰ خوبیاں شامل ہوں۔

افلاطون کے نزدیک لچک دار آئین وہ ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات یا مختلف قسم کے سیاسی مسائل کو سلجھانے کی صفت موجود ہو۔ ورنہ بے رحم قانون کے اطلاق کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے خیال میں ڈیموکریسی کا مطلب ریاست کے تمام شہریوں کی قانون کی نظر میں برابری، ایک منتخب اپنے اعمال کی جوابدہ انتظامیہ اور عوام کا یہ حق ہے کہ وہ بھی غور و فکر اور فیصلہ کا حق رکھتے ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ عوام غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باعث اس کام کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کے

فیصلے غیر مناسب ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک اریسٹوکریسی کا مطلب امرا اور شرفا کی حکومت ہے لیکن یہ لوگ اپنی خاندانی عزت و وقار کے معاملہ میں بڑے حساس ہوتے ہیں اور ان خاندانوں کے آپس کے جھگڑے آخر کار خانہ جنگی کا باعث بنتے ہیں۔ بادشاہی نظام اگرچہ سماج کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار مطلق العنان بادشاہ ایک مغرور، جاہل اور خود غرض آمر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس کتاب میں خاصے منطقی اور کھرے انداز میں عقل اور لذت کے باہمی رشتے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی زندگی کی غرض و غائیت لذت کا حصول ہے یا دانش کا۔ نتیجے کا طور پر کہا گیا ہے کہ زندگی جس کا مطلب صرف لذت اندوزی ہو اچھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ لیکن وہ زندگی بھی قابل تحسین نہیں ہے جس میں تمام توجہ صرف دانش کے حصول پر مرتکز ہو۔ لذت اور دانش دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ البتہ لذت کو دانش کے تابع ہونا چاہیئے۔ بحث کے دوران خالص اور مخصوص لذتوں اور وحدت و کثرت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہر شے کا آسمانی عین اپنی جگہ لیکن ناسوت میں وہ کثرت کے روپ میں ظاہر ہونے پر مجبور ہے انسانی ادراک بھی اسی عالم آب و گل تک ہے اور حقائق کی وحید اور تنزیہی صورتوں تک اس کی رسائی بہت بعید ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں سماج کے مختلف عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ "انسانی فطرت کے ان مختلف پہلوؤں کا تعلق انسانی مزاج کے مختلف پہلوؤں سے ہے اور معاشرے میں موجود مختلف طبقات کی موجودگی کی بنیادی وجہ بھی یہی فطرت اور مزاج کا تنوع ہے۔ افلاطون کی اس کتاب میں Republic کی طرح سوشلزم یا کمیونزم کا تصور موجود نہیں ہے۔

25۔ تامیس (Timaeus) اس کتاب میں طبعی علوم کا ذکر ہے۔ تامیس آپس میں مربوط تین مکالموں میں سے پہلا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ کری تیاس نامکمل رہ گیا اور تیسرے حصے کا لکھے جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ یہ افلاطون کی واحد تصنیف ہے جس میں کونیاتی اور انسانیاتی

مباحث ہیں اور طبعی علوم سے التفات کیا گیا ہے۔ یورپی فکر کی تاریخ میں اسے ایک اہم دستاویز کا رتبہ حاصل ہے۔ بیانیہ حقائق، مشاہدات، اساطیر اور خیال افرینوں کا پر تکلف ملغوبہ ہے۔ اسلوب ایک خاص وضع کے معرفت آمیز وقار کا حاصل ہے۔ نثر کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ اس مکالمہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ دنیا جہاں کو ایک الوہی ہستی نے بنایا۔ اسی ہستی کو مکالمہ میں کہیں باپ، کہیں بنانے والا اور کہیں صناع کہا گیا ہے۔ یہ خالق نہ تو لائق پرستش قرار دیا گیا ہے نہ وہ یونانی دیوتاؤں کے مہادیو تازیوس کا ہم پلہ ہے اور نہ ہی یہودی یا مسیحی روایات کے قادر مطلق سے کوئی نسبت رکھتا ہے۔ اعیان ثابتہ اس سے بالاتر ہیں۔ وہ تنہا بھی نہیں کیونکہ اسی نے دوسری آسمانی ہستیوں، دنیا اور ستاروں کی روحوں اور انسانی روح میں لبدی جوہر کو تخلیق کیا ہے اس مکالمہ میں زیادہ توجہ بعض فلسفیانہ اصولوں، فلکیاتی امور، عناصر اربعہ اور انسانی نفسیات اور عضویات پر مرکوز ہے۔ طبعی علم کی ریاضیاتی بنیادوں کا جائزہ بہت دلچسپ انداز میں لیا گیا ہے۔ ٹائیس کے مطابق اس کی باتوں کو قرین قیاس افسانے سمجھنا انصاف ہوگا کیونکہ ہر لحظہ تغیر آمادہ طبعی دنیا کے موجودات اور معاملات کو جچے تلے سائنسی انداز میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

26۔ کرائیٹس (Critias) اس کتاب میں مثالی ریاست کا شاہی طرز حکومت سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس مکالمہ میں اٹلانٹس کے گم گشتہ براعظم کا قصہ ہے۔ اٹلانٹس میں پہلے مست جگ کی سی فضا تھی لیکن وہاں کے باسیوں نے دیوتاؤں کو فراموش کر دیا اور یوں خود آسمانی قہر کو دعوت دی۔ دیوتاؤں نے اس براعظم کو سمندر میں غرق کر دیا۔ افلاطون نے یہ کہانی ادھوری چھوڑ دی ہے۔

27۔ قوانین اور ایپی نومس (Laws and Epinomus) اس کتاب میں نظریہ امثال کی روشنی میں دنیاوی ریاست کے قوانین اور عام آدمی کی زندگی کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب افلاطون کی آخری تصنیف ہے یہ بارہ ابواب پر ایک ضخیم، بے اوق، بے رس اور الجھی ہوئی کتاب ہے۔ اس تصنیف میں تین شرکا جن میں ایک کا

تعلق ایتھنز، دوسرے کا تعلق کریٹ اور تیسرے کا تعلق سپارٹا سے ہے اور جوزیوس سے منسوب غار اور ملجا کی زیارت پر جاتے ہیں کے درمیان مکالمہ ہے جو دراصل ایتھنز کے شریف زادے کی طولانی تقریر کی صورت میں ہے جس کے دوران کبھی کبھی دونوں ساتھی بھی بول اٹھتے ہیں۔

قوانین میں جس مثالی ریاست کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس پر قوانین کا مکمل راج ہے۔ اس مکالمہ میں قوانین کی جو وضاحت شامل ہے وہ عام طور پر معاصر ایتھنزی قانون سے مستعار لی گئی ہیں۔ تاہم انہیں وضع کرتے وقت قوانین کے دوسرے مجموعوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے قانون سازی کی گئی ہے۔ شر سے بچنے کے لیے مثالی ریاست میں سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ سرکاری رقوم کے غبن، جنسی جرائم، غداری، دہریت، بدعت اور مقدس چیزوں کی بے حرمتی کی سزا موت تجویز کی گئی ہے۔ کسی فرد کو سونا چاندی رکھنے کی اجازت نہیں ہے لوگ صرف روزمرہ کی ضروریات کے لیے اپنے پاس ریزگاری رکھ سکتے ہیں۔ جہیز لینے دینے پر مکمل پابندی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی یکساں تعلیم کا انتظام ہے۔ غلاموں سے بیگار لی جائیگی اور غیر ملکیوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جائے گا۔ دراصل اس تصنیف کے ذریعے افلاطون نے مثالی ریاست کے خدوخال متعین کرنے کی دوسری بار کوشش کی اس کتاب کے حوالہ سے ایک طنز نگار لوکیانوس نے اپنی ایک تحریر میں زیوس کو یہ واویلا کرتے دکھایا ہے کہ "انسانوں نے مجھے بھلا دیا ہے اور میری قربان گاہیں افلاطون کے قوانین سے بھی زیادہ ٹھنڈی نظر آ رہی ہیں"

اس کتاب میں افلاطون کے تجربے کا دھیماپن موجود ہے اور موضوعات کی ترتیب بھی غیر واضح ہے پہلی چار جلدیں تمہیدی مواد پر مشتمل ہیں جن میں سے دو میں گانے، ناچ اور شراب کے تعلیمی نظام جبکہ دوسری دو جلدوں میں تاریخی لحاظ سے ریاست کی تخلیق اور ارتقا کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد چار جلدیں ایک

ائین کی تیاری کے مواد پر مشتمل ہیں اور ان میں نظام تعلیم اور معاشرتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ان کے بعد کی تین جلدوں (9 سے 11) میں ایک قانونی ضابطہ پیش کیا گیا ہے جو اس کتاب کا اہم ترین حصہ ہے جبکہ آخری جلد میں نئے سیاسی اداروں کو متعارف کروایا گیا ہے اس کتاب میں افلاطون نے مذہبی قوانین اور جزا وسزا پر بھی بحث کی ہے اور قانون کے بنیادی اصول بیان کئے ہیں اور ایک مخلوط آئین جس میں مونارکی اور ڈیموکریسی دونوں موجود ہیں پیش کرتے ہوئے اس آئین کو تصور اور حقیقت کا درمیانی راستہ قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں جو سول اور کریمنل قوانین اور ضابطے دیئے گئے ہیں وہ دراصل ایتھنز کے قدیم قوانین کی ترتیب و تالیف تو ہیں۔ان قدیم قوانین میں افلاطون نے بڑی فلسفیانہ اور قانونی مہارت سے ایسی جدت پیدا کی کہ اس سے نہ صرف یونان بلکہ روم بھی مستفید ہوا۔

افلاطون کے نزدیک بنیادی چیز یہ ہے کہ قانون ساز قانون سازی کا کام شروع کرے تو اس کے ذہن میں مکمل نیکی کا تصور موجود ہونا چاہیے۔ریاست اور ریاستی قوانین شہریوں کی اخلاقی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں جو تمام پہلوؤں سے ہونی چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں عقل ودانش اور تدبر کا دارومدار ضبط نفس پر ہے۔اور عقل ہمارے ذہن یا ریاست میں صرف اسی صورت کام کرتی ہے جب ہم آہنگی موجود ہو جو بذات خود ضبط نفس کی پیداوار ہے۔یہ اصول اس لیے اہم ہے کہ Appetite کا عنصر Reason کے عنصر کے سامنے رضاکارانہ اطاعت اختیار کرتا ہے اور یہی ہم آہنگی کی بنیاد ہے جو ایک قانون کی حکمرانی کو تسلیم کرنے والی ریاست کی اولین ضرورت ہے اور یہی سماجی اور سیاسی ہم آہنگی عمل و نظریہ کی آزادی کا جوہر ہے کوئی بھی ریاست جو ضبط نفس کے اصول کی بجائے کسی اور نیکی کے اصول کے تحت قائم ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔

افلاطون کے نزدیک اصل بہادری کی بنیاد ضبط نفس سے ہے اور ضبط نفس کے لیے دانش اور انصاف جیسی صفات ہونا ضروری ہے۔اصل بہادری یہ نہیں کہ ریاست

کے اندرونی خلفشار کو جو جہالت اور بے انصافی کی پیداوار ہوتا ہے نظر انداز کر کے دوسری ریاستوں سے جنگ چھیڑ دی جائے جن کا آخری نتیجہ تباہی اور ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ریاست کو ضبط نفس کے اصول کے تحت لایا جائے تاکہ ریاست کے اندر امن اور قانون کی بالادستی قائم ہو۔

افلاطون کے نزدیک جنگ ایک سیاسی بیماری کی مانند ہے اور جو ریاستیں جنگ ہی کو اپنا نصب العین بناتی ہیں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتی ہیں کہ وہ اصولی طور پر مکمل ریاست کا درجہ نہیں رکھتیں اور ان کا نظریاتی وجود نامکمل ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "ریاست میں کوئی قلعہ بندی نہیں ہونی چاہیے یہاں تک کہ شہر کی فصیل بھی نہیں ہونی چاہیے"۔

اس کتاب کی نویں جلد میں وہ قانون کی تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انفرادی طور پر ہمارا ذہن اس قابل نہیں ہے کہ وہ سوچ سکے کہ معاشرتی زندگی کے لیے کیا بہتر ہے اور جب یہ شعور پیدا ہو جائے اور ہمارا انفرادی مزاج اتنا بہتر ہو کہ ہمیں سماجی اور اجتماعی بھلائی کی طرف راغب کر سکے تو اس وقت قانون کی ضرورت ہے انسان کو جس اچھائی کی تلاش ہے وہ اجتماعی بھلائی کا اصول ہے اور یہی اصول انسان کی سماجی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہمیں قانون کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اس قوت کی بھی ضرورت ہے جو اسے نافذ کر سکے۔ قانون ہی وہ اصول ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔

افلاطون کے خیال میں انفرادی مفاد اور خود غرضانہ مفادات کے اس چکر میں اگر کوئی شخص خدا کے فضل اور مہربانی سے خدا کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کی بنیاد پر اجتماعی نیکی کی جستجو کرے تو ایسے شخص کو بظاہر راہنمائی کے لیے قانون کی ضرورت نہیں کیونکہ فطری نیکی اور عقل و دانش سے بڑھ کر دوسرا کوئی قانون نہیں اس لحاظ سے ایک دانشمند اور آزاد ذہن اپنا راہنما خود ثابت ہوتا ہے اور اسے کسی دوسری راہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ایک دیوتائی خواب ہے قانون علمی و عقلی تدبر کی تخلیق ہے اور اپنی ذات میں ہمہ گیر ہونے کے باعث درست سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسان اپنی خواہشوں کے باعث ایک کھلونا ہے۔ایک طرف اسے انفرادی خواہشوں کی ڈوریاں کھینچتی ہیں تو دوسری طرف روحانی ڈوری، جس کا تعلق عقل و تدبر سے ہے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہی ریاست کے عمومی قانون کی بنیاد ہے۔

افلاطون کے نزدیک جب بہت سارے خاندان کسی ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو مختلف خاندانوں کے مختلف رسم و رواجوں کے ٹکرانے سے قانون سازی کی ابتدا ہوئی اور پھر قابل عمل رسم و رواج کو منتخب کرتے ہوئے ان کے مطابق قانون سازی کی گئی۔اس کے نزدیک قانون سازی کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں اور یہ لوازمات مخصوص قسم کے حالات ہوتے ہیں جو قوانین کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

اس کتاب میں افلاطون نے اپنے فلسفیانہ نظریات تواریخی حوالوں کی مدد سے پیش کئے ہیں جس میں وہ اپنے فلسفیانہ تدبر کے ذریعے انسان کی سماجی زندگی کے ارتقا کے اصولوں پر علمی اور عقلی بحث کرتا ہے۔اس کے نزدیک تاریخ ایک سوشل سائنس ہے۔ افلاطون تاریخ کا آغاز طوفان عظیم سے شروع کرتا ہے اور پھر اپنے دور تک انسانوں کی سماجی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس قسم کی ریاست اور کس قسم کے قوانین انسان کی سماجی اور سیاسی زندگی کو ترقی دینے کے باعث ہیں اور وہ کون سے قوانین تھے جن کے باعث تباہی و بربادی ہوئی اور قوانین میں کس قسم کی تبدیلیاں لاکر ریاست کو خوشحال بنایا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک گو جمہوریت میں جہالت بھی علم کے طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن آزادی کی نعمت جمہوریت ہی کی مرہون منت ہے۔بادشاہت اپنی بری شکل میں انسان کی فطری آزادی کی دشمن ہوتی ہے لیکن اپنی حقیقی صورت میں عقل و دانش اور تدبر کی حکمرانی کی نمائندہ ہوتی ہے ۔ علم و دانش، آزادی اور خوشحالی ہی ایک ریاست کو حقیقی ریاست بناتی ہیں۔

افلاطون کے خیال میں ہر شہر کو خود کفیل ہونا چاہیے اور اسے اپنی ضروریات

کی ہر چیز خود پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے نزدیک سمندری فوج یا سمندری راستے سے تجارت قوم کے مزاج کو بگاڑتے ہیں۔ سمندر کسی شہر کو بھی تجارتی مرکز اور بندرگاہ بنا سکتا ہے جس سے لوگ دولت کے پجاری بن جاتے ہیں یہ کاروباری ذہنیت جس طرح ریاست کے اندر ہم آہنگی کو ختم کر دیتی ہے اسی طرح دوسری ریاستوں سے بیرونی تعلقات بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ریاست کا اقتصادی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس پر اچھے قانون کی بنیاد رکھی جا سکے۔ آئین بادشاہت اور جمہوریت کا مرکب ہو اور اس میں حکم کا عنصر موجود ہو۔ مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی قائم کرے۔ اس کے خیال میں آئین کے تین درجے ہوتے ہیں اعلیٰ ترین، دوسرے درجے کا اور تیسرے درجے کا آئین۔ بہترین آئین اقتصادی اشتراکیت پر مبنی ہوتا ہے جبکہ دوسرے درجے کے آئین میں بہترین آئین کے بنیادی اصول شامل کیے جاتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ہر شہری کی جائیداد دو حصوں میں تقسیم ہونی چاہیے کچھ حصہ شہر کے اندر اور کچھ حصہ سرحد کے قریب۔ ریاست کے تمام شہریوں کی جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوتے ہوئے بھی ریاست کی اجتماعی ملکیت تصور ہو گی اور ریاست کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر استعمال ہو گی۔ سونا چاندی قومی ملکیت تصور ہوں گے۔ ایسی علاقائی کرنسی زیر استعمال لائی جائے گی جو دوسرے ملکوں یا علاقوں میں قابل استعمال نہ ہو۔ قرضہ دینے والا اپنی ذمہ داری پر قرض دے گا اور اس کے لیے کوئی قانونی ضمانت بہتر ہو گی۔

افلاطون کے خیال میں قانون کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو دولت کے پیچھے دوڑنے سے روکے جس سے ریاست اور عوام دونوں کا بھلا ہو گا۔ زراعت صرف اس قدر ہونی چاہیے جس قدر عوام کو خوراک کی ضرورت ہو۔ ریاست کے شہریوں کا کام صرف سیاسی فرائض ادا کرنا ہے جب کہ غیر ملکی لوگ صنعت اور تجارت کریں۔ درآمدات اور

بر آمدات پر ٹیکس نہیں ہونا چاہئے اور غیر ضروری تعیش کے سامان کی در آمد پر پابندی ہونی چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں تمام سماجی اور سیاسی معاملات میں خواتین کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے اور خواتین کو مردوں کے ساتھ ریاست کی عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح مشترکہ دستر خوان پر کھانا چاہیے اور انہیں مردوں جیسی عمومی تعلیم و تربیت حاصل کرنا چاہیے۔ خواتین کو مردوں کی طرح فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیے اور مردوں کی طرح کھیلوں میں حصہ لینا چاہیے۔ عورت اور مرد کی شادی ریاست کی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہونی چاہیے اور ایسے جوڑے منتخب کئے جانے چاہئیں جن سے ذہنی و جسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اچھی اولاد پیدا ہو۔

افلاطون ریاست کے مستقل اداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک حقوق یافتہ ریاست کی کل 5040 افراد پر مشتمل آبادی کی ایک عوامی اسمبلی ہونی چاہئے جو الیکٹورل اتھارٹی کے طور پر 300 ارکان پر مشتمل کونسل جرنیلوں اور انتظامی افسران کا انتخاب کرے۔ یہ عوامی اسمبلی تین مراحل میں 300 میں سے 175 امیدواروں کو گارڈینز آف دی لاء کے طور پر منتخب کرے گی جو بطور حکمران فرائض سرانجام دیں گے۔ کونسل کا انتخاب مختلف طریقوں سے ہر سال ہوگا۔ پہلے مرحلے میں 90 ارکان، دوسرے مرحلے میں 180 ارکان اور تیسرے مرحلے میں باقی ارکان شہریوں کے چاروں طبقات میں سے منتخب ہونگے۔ اس طرح افلاطون نے یہ نظام عوامی انتخاب اور طبقاتی انتخاب کے اصولوں پر مرتب کیا جسے یونان میں جمہوری انتخاب یا اشرافیہ کا انتخاب کہتے تھے۔

یہ اسمبلی حکومت اور کونسل کے ارکان اور سرکاری افسران کے انتخاب کے علاوہ عوامی عدالت کے فرائض بھی سرانجام دے گی۔ کونسل 12 حصوں پر مشتمل ہوگی اور ہر حصہ اپنی باری پر انتظامی افسران کے ذریعے ریاست کا کاروبار چلائے گی۔ افسران کی تعداد 37 ہوگی اور ہر مجسٹریٹ جس کی عمر 50 سال سے کم اور 70 سال سے زائد نہ

ہو گی، 20 سال کے لیے منتخب ہو گا۔ تمام مجسٹریٹ خفیہ طور پر وزیر تعلیم کا گارڈینز آف دی لاز میں سے انتخاب کریں گے اور یہ شخص لائق ترین ہو گا۔

افلاطون کے نظام عدل میں تین قسم کی عدالتیں کام کرتی ہیں۔ پہلی وہ جو فریقین کے ہمسائے اور قریبی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے دوئم ریاست کے 12 قبائل میں ہر قبیلے کی ٹرائل کورٹ ہے جس کے جج کا انتخاب ووٹ کے ذریعے کیا جاتا ہے اور سوئم منتخب جج کی عدالت ہے جس کے ججوں کا انتخاب مجسٹریٹس ہر سال کرتے ہیں۔ یہ ایک کھلی عدالت ہے اور لوگوں کے سامنے اپنا فیصلہ سناتی ہے۔

مختصر افلاطون کے نظام حکومت میں ایک عوامی اسمبلی" منتخب شدہ کونسل " گارڈینز آف دی لاز کا انتظامی ادارہ "فوجی جرنیل "عدالتیں اور علاقائی افسران ہیں۔ اسمبلی کے اہم ممبران پہلے اور دوسرے طبقے کے افراد ہیں جن کی شمولیت اسمبلی میٹنگز کونسل کے انتخاب اور تشکیل میں لازمی ہے۔ تیسرے اور چوتھے طبقات کے افراد بھی عوامی اسمبلی کے باقاعدہ ممبر ہوتے ہیں لیکن یہ اتنے اہم نہیں ہیں۔ کونسل بارہ حصوں میں تقسیم ہے اور ہر ایک حصہ ایک ماہ کے لیے اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔ گارڈینز آف دی لاء کا انتخاب چاروں طبقات کے افراد مشترکہ طور پر کرتے ہیں جبکہ فوجی جرنیلوں میں کچھ کا انتخاب اور کچھ کو نامزد کیا جاتا ہے۔ عدالت کا انتخاب بھی عوامی سطح پر ہوتا ہے۔ اس طرح افلاطون نے اریسٹوکریسی اور اولیگارکی کو ڈیموکریسی میں بڑی مہارت اور صفائی سے شامل کیا ہے اور علم و دانش کی حاکمیت کے اصول کو دولت اور آزادی کی حاکمیت کے اصول میں مدغم کرنے کی کوشش کی ہے۔

افلاطون کے نظام حکومت میں ریاست کے شہریوں کی جائیداد اور شادیوں پر ریاست کا کنٹرول ہے اور ہر قسم کے فنکار حکومتی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ سقراط کے ریپبلک کے لیے نوکٹرل کونسل ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ جیسے ایک زندہ جسم میں ایک دماغ ہوتا ہے اور دماغ کے لیے حواس خمسہ ہوتے ہیں اسی طرح ریاست بھی ایک جسم

کی مانند ہے اور یہ نو کچرل کونسل اس کا دماغ ہے جبکہ ریاست کے دوسرے ماتحت ادارے اس کے مددگار ہیں ذہن خود بھی ایک ہے۔ اس کی مخصوص سوچ بھی ایک ہے اور یہ اپنے ایک خاص مقصد کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور وہ نیکی اور اچھائی ہے جو مرکب چیز ہے اس مجموعی نیکی یا اچھائی کے حصول کا واحد طریقہ علم ہے اور ایک ریاست کے لیے حقیقی اچھائی صرف حقیقی حکمران کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اور جب تک ایک حکمران کے پاس مجموعی نیکی کا علم نہ ہو وہ فطری حکمران نہیں ہے ۔ مجموعی نیکی کے آفاقی تصور کے عرفان کے لیے بہت زیادہ تعلیم و تربیت اور محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔

افلاطون کے نزدیک تمام چیزیں ایک اجتماعی صورت میں خدا کی ذات میں مجتمع ہوتی ہیں اور وہی شخص خدا کی ہستی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے جو نیکی کی مجموعی صورت کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ خدا کی تخلیق پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کائناتی اکائی میں اپنی ذات کو بھی کائنات کے ایک مخصوص حصے کے طور پر جاننے کے قابل ہوں۔ ہم جس علم کے ذریعے نیکی کی مجموعی صورت اور خدا کی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں وہ علم فلکیات ہے۔ اس علم کے ذریعے انسان مادے کی حرکت کے قانون کے تحت مادے کی حرکات کا مشاہدہ کرتا ہے اور ذہن جو مادہ کی سب سے اعلیٰ اور تجریدی صورت ہے کائنات میں بنیادی حرکت کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے انسان کو خدا کی ذات اور مجموعی نیکی کے عرفان کے لیے کائنات اور اس میں موجود اجسام کی حرکات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انسان کو اس ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ستاروں میں متحرک ہے اور بنیادی طور پر وجود کا باعث ہے۔ انسان کو ان تمام مضامین کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس مقصد میں ہمارے معاون ثابت ہوں ہمیں اس لحاظ سے موسیقی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ موسیقی میں موجود ترتیب اور ترکیب بھی کائنات میں موجود ترتیب و ترکیب جیسی ہے اور پھر ہمیں ان تمام چیزوں پر گہرائی سے غور کرنا چاہیے تاکہ ہماری سوچ میں گہرائی آئے۔

افلاطون کے نزدیک ذہانت علم ہندسہ کی مرہون منت ہے۔ تمام اعمال و افکار اسی علم ہندسہ کے باعث ہیں۔ یہ علم انسانیت کے لیے ایک خدائی تحفہ یا خدائی نعمت ہے۔ اجسام فلکی بھی ذہن رکھتے ہیں جو مسلسل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے کائنات کا تسلسل بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اجسام مادہ نہیں بلکہ دماغ یا ذہن ہیں اور جو اس ذہن کی ذہانت کا راز پا لیتا ہے عرفان حاصل کر لیتا ہے۔ علم فلکیات کا مطلب صرف سورج چاند کو نکلنے اور ڈوبتے ہوئے دیکھنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اس تدبر کا مطالعہ ہے جس کے تحت یہ اجسام حرکت کرتے ہیں اور اس ذہن کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے جو ان کو متحرک کرتا ہے۔ ہر ڈائیگرام 'ہندسوں کا نظام 'ہم آہنگی کا ہر منصوبہ اور ہر طرح کی مطابقت جو ان اجسام میں ہے وہ ایک اکائی کی طرح ظاہر ہونی چاہیے اور جب انسان یکسو ہو کر سوچے گا تو پھر ازلی ذہانت اور دانش کے ذریعے وہ سماجی خوشی اور خوشحالی حاصل کرے گا۔

اس کتاب میں نظریہ امثال کی روشنی میں دنیاوی ریاست کے قوانین اور عام آدمی کی زندگی کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ افلاطون نے اس کتاب میں عدالتوں اور سزاؤں کو افراد کی اصلاح کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ "اس سے مجرم کی نیکی میں اضافہ اور بدی میں کمی ہوتی ہے" یہ تصنیف روسی قانون دانوں کے لیے رہبری کی حیثیت رکھتی ہے اور یورپ میں اس کا گہرا اثر موجود ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں انسان کو خدا کے کھلونے سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسان کو مجبور و بے بس' جرم و سزا کا پابند اور ہر وقت رہبری کا محتاج بتایا گیا ہے۔ اس کے تمہیدی چار حصوں کے ابتدائی دو حصوں میں رقص اور موسیقی کی تعلیمی قدریں تیسرے حصہ میں مملکتوں کی تاریخی نشو و نما اور چوتھے حصے میں سیاسیات کے اعلیٰ اصول بیان کیے گئے ہیں۔ بعد کے تین حصوں میں دستور کی تفصیل نویں حصہ میں تقریریں دسویں حصہ میں مذہبی اور گیارہویں حصہ میں عدالتی قوانین کا ذکر ہے۔ آخری حصوں میں نئے ادارے اور ان کے ضابطوں پر بڑی فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں حاکم اور محکوم دونوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ملکیت کا حق شہریوں کو مملکت کی جانب سے عطیہ کی شکل میں دیا گیا ہے۔ افلاطون کے خیال میں شہریوں کا ذریعہ معاش زراعت ہونا چاہیئے۔ اس کے خیال کے مطابق زرعی اراضی کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا سرحد پر ہونا چاہیے تاکہ شہری مملکت کی حفاظت بھی کر سکیں۔ دست کاری صنعت و حرفت اور تجارت و مملکت کی نگرانی غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک مملکت کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کو زیادہ دولت کمانے سے روکے اور سمندر کے نزدیک شہر نہ بسائے۔

افلاطون نے اس کتاب میں عورتوں کو نہ صرف سیاسی حقوق دیئے ہیں بلکہ مرد اور عورت کے لیے تعلیم یکساں اور لازمی قرار دی ہے۔ شادی کو ہر طبقے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور حکمران طبقے اور سپاہیوں کو شادی کرنے اور جائیداد رکھنے کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ شادیوں میں مزاج کی مناسبت کا لحاظ رکھنا اور شادی کے دس سال بعد تک میاں بیوی کو مملکت کی طرف سے مقرر کردہ تجربہ کار عورتوں کی نگرانی میں رکھنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں وہ ان اصولوں کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کی رائے میں مستحکم اور پائیدار دستور عمل میں آسکتا ہے۔ لہٰذا وہ دانائی اور آزادی کو ملا کر دستور پیش کرتا ہے۔ انتظامیہ ان عہدیداروں کے ہاتھوں میں دی گئی ہے جن کا چناؤ شہری ایک عام مجلس میں کرتے ہیں۔ عہدیداروں کے علاوہ محتسبوں کی بھی تقرری ضروری قرار دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس سے حکمرانوں کا محاسبہ اور شہریوں کے عام اخلاق کی نگرانی ہو سکتی ہے۔ قانون میں خدائی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان کو عقیدے اور قانون کی شکل کی حیثیت سے ہر شہری پر لازم قرار دیا گیا ہے۔

"مثالی ریاست" کے نظریے کے تحت سسلی کا بادشاہ ڈیونی سی اوس دوم نے اسے مثالی ریاست کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کہا۔ جس کی اس نے بے حد کوشش کی مگر

ناکام رہا۔ دل شکنی اور رنج والم نے اسے صاحب فراش کر دیا اور آخر کار یہ عظیم دانش مند اور مفکر و مدبر ایتھنز میں 347ق م میں موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گیا۔

یہ کتاب افلاطون کی آخری کتاب تھی جو اس کی وفات کے بعد اس کے شاگرد فلپ آف اوپو نے شائع کرائی۔ مدبر اور قوانین میں بیان کئے گئے سیاسی نظریات الجمہوریہ میں پیش گئے گئے نظریات سے مختلف ہیں بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان دونوں کتب میں پیش کئے گئے نظریات افلاطون کے آخری اور قطعی خیالات کا اظہار ہیں۔

29۔ خطوط(Letters)

افلاطون سے جو نثری سرمایہ منسوب ہے اس میں تیرہ مکاتیب بھی شامل ہیں۔ موجودہ دور کے محققین کا خیال ہے کہ ان میں سے تیسرے، ساتویں اور آٹھویں میں مکتوب کے اصلی ہونے کا قوی امکان ہے ساتواں مکتوب جو ڈیون کی ہلاکت کے بعد اس کے دوستوں کو لکھا گیا تھا طوالت کے لحاظ سے باقی بارہ مکاتیب کے مجموعی حجم کے برابر ہے۔ افلاطون کی زندگی کے حالات کے حوالے سے "یہ نہایت دقیع دستاویز ہے۔ یہ مکتوب موجود نہ ہوتا تو افلاطون کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلوم نہ ہو سکتا۔ اس مکتوب میں افلاطون نے اپنی ابتدائی زندگی" عوامی سیاست سے کنارہ کشی اور صقلیہ کی عملی سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ تیسرا مکتوب بادشاہ ڈیونی سی اوس دوم کے نام ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب بادشاہ اور ڈیون کے تعلقات کشیدہ تھے۔ آٹھویں مکتوب میں ڈیون کے دوستوں کو سیاسی نوعیت کے بعض مشورے دیئے گئے ہیں۔ افلاطون کی کہی گئی چند نظمیں بھی ملتی ہیں جن سے اس کی شعری استعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

افلاطون کا نظام فلسفہ

افلاطون کا فلسفہ دراصل سقراط کے فلسفے کا تسلسل ہے۔اس کے نزدیک فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے افکار سے کردار انسانی کے لیے بصیرت اور ہدائت مہیا کرے اور فلسفے سے اخلاقی زندگی کی اصلاح علم کے ذریعے ہونی چاہیے اور سچا علم وہی ہے جو حکمتی تصورات پر مبنی ہو۔ وہ اپنی تصانیف میں سقراط کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مکالمے کے ذریعے تصورات کو مکمل کرتا ہے۔ شخصی مکالمہ رفتہ رفتہ ادیبانہ صورت اختیار کرتے ہوئے مسلسل تقریر کا انداز پیدا کرتا ہے اور اپنے فلسفے میں ضمیات اور افسانوں سے جان ڈالتا ہے۔اس کے نزدیک سوفسطائیت میں پائے جانے والے نقائص کا علاج فقط فلسفیانہ علم اور فلسفیانہ زندگی سے ہو سکتا ہے۔ علم ہمیشہ صحیح ہوتا ہے لیکن استحضار صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی بلکہ صحیح استحضار بھی علم اور جہل کے بین بین ہوتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک "عام نیکی" جس کا مدار رسم ورواج اور ادراک پر ہوتا ہے۔ حوادث کا تختہ مشق ہوتی ہے اور خیر اور شر دونوں کو صحیح سمجھتی ہے اس کے محرکات ایسے ناپاک ہوتے ہیں کہ اس کے اندر اخلاق کی بنیاد تمام تر لذت اور منافع پر قائم ہوتی ہے۔ فقط علم ہی عمل کی درستی کا ضامن ہو سکتا ہے کیونکہ عمل عامل کے خیالات سے متعین ہوتا ہے اور کوئی شخص عملاً برا نہیں ہوتا۔ بصیرت عقلی زندگی کی غایت ہے جس کے لیے باقی تمام چیزیں قربان کر دینی چاہئیں۔ یہ خیال کہ ہر انسان خود ہی نیک و بد اور حق و باطل کا معیار ہے تمام صداقت کے منافی ہے اور خود ہی اپنی تردید کرتا ہے۔ لذت کو زندگی کا اصل مقصد قرار دینا اور ہر فرد کا ذاتی منافع کو اس کے لیے جائز سمجھنا نیکی اور

لذت میں غلط عث پیدا کرنا اور متغیر مظاہر اور سرمدی حقیقت کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے۔
اصل علم اور خیر کی قیمت مطلق ہے۔ نفع و ضرر اور لذت و الم اضافی ہیں۔

افلاطون کے خیال میں فلسفے کا مدار عشق (Eros) پر ہے جو فانی کو غیر فانی بنانا چاہتا ہے۔ محسوس سے معقول کی طرف اور جزو سے کل کی طرف ترقی کرتا ہے اور عقلی تصورات کا وجدان پیدا کرتا ہے۔ عقلی تصورات فکر برہانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فکر دو طرح کا کام کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ جزئی سے کلی کی طرف اور اضافی سے مطلق کی طرف لے جاتا ہے اور ثانیاً وہ ان کو الگ الگ کرتا ہے۔ یہ تقسیم جزئی اور کلی کے درمیان بہت سے واسطے پیدا کر دیتی ہے اور ہم کو تصورات کا باہمی ربط بتاتی ہے۔

پارمینائڈیز کے مکالمے میں افلاطون تناقضات کے ذریعے سے تصورات قائم کرتا ہے۔ اسطفاف میں وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا مدار اشیاء کے اختلاف کیفیت پر ہونا چاہیے اور اسے بتدریج قدم بہ قدم چلتے ہوئے کسی درمیانی کڑی کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ کریٹی لس میں افلاطون اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ منطق کو زبان کی صحت کا خیال رکھنا بھی لازمی ہے کیونکہ اشیاء کی ماہیت کو صحیح طور پر بیان کرنا زبان کی صحت پر مبنی ہے لیکن تصورات کو بر طرف کر کے محض الفاظ سے نتائج اخذ کرنا بھی غلط ہے۔ اس کے نزدیک فلسفہ فقط صحیح علم ہی کا ضامن نہیں ہے بلکہ اخلاق کا بھی کفیل ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان محسوسات کی زندگی سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ اہم ترین بات عقلی تصورات قائم کرنا ہے۔ باقی تمام تعلیم و تربیت اس کے لیے ایک تیاری ہے۔ موسیقی اور جسمانی ورزش سے سیرت کی تہذیب ہوتی ہے۔ اسی طرح ریاضیاتی علوم سے فکر کی تربیت ہوتی ہے کیونکہ وہ انسان کو محسوس سے نامحسوس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں فلسفے کا اصل آلہ فکر بذریعہ تصورت یعنی منطق ہے اس کے نزدیک اصل وجود فقط تصورات کا ہے اور علم کا وجود فقط وجود ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادراک کی حقیقت مدرکات کی حقیقت کے مطابق ہوتی ہے۔ فکر کا معروض محسوسات کے معروض سے اتنا ہی جدا ہو گا جتنا کہ فکر

احساس سے جدا ہے۔اس نقطہ نظر سے تفکر علمی کا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ تصورات کے مستقل وجود کو تسلیم کیا جائے۔ ہر حالت میں ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اشیاء کے غیر محسوس جوہر کو ان کی محسوس نمود سے ممتاز اور جدا قرار دیں۔

افلاطون کے نزدیک تصور اشیاء یا صورت اشیاء ہی جوہر اشیاء ہے۔اس کے خیال میں جب ہم مختلف اشیاء کے لیے ایک ہی نام استعمال کرتے ہیں تو وہ نام اُن کے مشترک تصور یا حد کلی کو ظاہر کرتا ہے۔اس کلی تصور کا وجود محض ہمارے فکر یا خدا کے فکر کے اندر نہیں ہے۔یہ علی الاطلاق بذات خود موجود ہے اور اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔یہ ان اشیاء کا جو اس سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں سرمدی نمونہ ہے لیکن ان سے الگ ہے فقط عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے۔وجود مطلق حکمت کا حقیقی معروض ہے۔ہر شے کے اندر جو وجود رکھتی ہے اپنی وحدت کے باوجود صفات کی کثرت بھی پائی جاتی ہے اور ہر دوسری چیز سے مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں لا محدود عدم بھی پایا جاتا ہے۔اسی لئے ہر تصور کی نسبت ہم کو یہ دریافت کرنا چاہئے کہ وہ کن دیگر تصورات سے متحد ہو سکتا ہے اور کن سے نہیں ہو سکتا۔

افلاطون مکالمہ پارمینا ئڈیز میں بالواسطہ یہ ثابت کرتا ہے کہ نہ کثرت بے وحدت ہو سکتی ہے اور نہ وحدت بے کثرت نہ صرف اشیاء بلکہ سرمدی جواہر میں بھی وحدت اور کثرت اور محدودیت اور لا محدودیت پائی جاتی ہے۔اسی طرح تصورات کے نا قابل تغیر ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم ان کو تغیر پذیر مظاہر کی علت قرار نہیں دے سکتے۔خیر کا تصور ہر قسم کے کمال اور ہر قسم کے وجود اور علم کی علت ہے۔الٰہی عقل پوری طرح خیر کے ساتھ منطبق ہے۔ہستی حقیقی ایک قوت فاعلہ ہے۔حرکت زندگی روح اور عقل سب اس کی بدولت ہیں۔

افلاطون کی تصانیف میں نہ صرف جواہر بلکہ تمام ممکن اشیاء کے صفات اضافات اور افعال کے تصورات ملتے ہیں۔نہ صرف فطری اشیاء بلکہ ان چیزوں کے بھی صفات

مذکور ہیں جو فن و صنعت کی پیداوار ہیں اسی طرح اچھی چیزوں کے علاوہ بری چیزوں کے تصورات بھی جو کلی حدود ہیں ان میں موجود ہیں۔ عظیم فی نفسہ' اسم فی نفسہ' یہاں تک کہ بستر فی نفسہ اور خلام فی نفسہ بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح گندگی اور ظلم اور عدم کا تصور بھی ان میں ہے۔

افلاطون کے خیال میں جو چیز جس طرح ہے وہ اس لئے ہے کہ اس کی بہترین صورت وہی ہو سکتی تھی اور ہر چیز کا صحیح تصور اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ خیر کو اس کی انتہائی غائیت قرار دیا جائے۔ خیر تمام وجود اور علم کی اساس اور اصل ہے۔ وہ ہر موجود کی حقیقت ہے اور ہر عالم کا علم۔ وجود کی اصل مطلق ہونے کی وجہ سے خیر اور خدا ہم ذات ہیں۔

افلاطون کے نزدیک اشیاء تغیر پذیر اور فنا پذیر ہوتی ہیں۔ تصور خالص اور کامل ہوتا ہے لیکن اشیاء ناقص ہوتی ہیں۔ کامل وجود تصور میں پایا جاتا ہے۔ اشیاء وجود اور عدم کے مابین رہتی ہیں جس طرح کہ حسی ادراک علم اور جہل کے بین بین رہتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک احساس کے نقص کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ کلیتہً تصور ہی اس کا ماخذ نہیں اس کے علاوہ اس کے اندر کچھ اور عنصر بھی داخل ہیں۔ اشیاء کے اندر جتنی حقیقت یا کمال پایا جاتا ہے۔ وہ تصور کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اشیاء کے دیگر عنصر کی ماہیت وہی ہو گی جو مظاہر حسی کو تصور سے الگ کرتی ہے۔ یہ عنصر لازماً لا محدود لا موجود لا معلوم اور لا ثابت ہو گا۔

افلاطون کے نزدیک مادہ مکان ہی کی ایک کثیف صورت ہے مادہ اور اشیاء اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ اجسام اس وقت بنتے ہیں جبکہ مکان کے کچھ حصے عناصر اربعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' جب وہ ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک جو چیز اشیاء کو تصورات سے ممتاز کرتی ہے وہ عدم ہے لیکن دونوں میں جو حقیقت ہے وہ مشترک ہے۔ اشیاء کی تمام حقیقت تصورات کی موجودگی اور

ان سے بہرہ اندوز ہونے میں ہے لیکن چونکہ تمام جسمانی صفات کا ماخذ عدم ہے اس لئے وہ بھی ایک طرح کی ثانوی علت ہے جو اندھا دھند اور غیر عقلی ہے۔ فطری مقاصد سے اس کا تعلق نہیں لیکن وہ ان کے حصول کے لئے ایک شرط مقدم بھی ہے اور عقل کے لیے تحقیق مقاصد میں حدود اور موانع بھی پیش کرتی ہے۔ اشیاء میں تصورات کے علاوہ جو دوسرا عنصر ہے اس کو بھی کسی نہ کسی قسم کا وجود ہی کہنا پڑے گا خواہ وہ تصورات سے کتنا ہی مختلف ہو تصورات اور اشیاء ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ تصورات نمونے ہیں اور اشیاء ان کی نقلیں۔

افلاطون کے خیال میں خالق عالم ایک زندہ ہستی کے نمونے پر روح کائنات کو اس کے عناصر ترکیبی سے مرکب کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ چار عناصر لیتا ہے ان سے کائنات بناتا ہے اور اس کو حیوانات اور نباتات سے آباد کرتا ہے۔ عالم چونکہ عقل کی پیداوار ہے اس لیے وہ کسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ مظاہر کی صحیح توجیہہ فقط علل غائیہ سے ہو سکتی ہے۔ مادی علل غائیہ کے عمل کے لیے محض شرائط واسباب ہیں۔

افلاطون کے مطابق کائنات کی تعمیر میں پہلے چار عناصر بنائے گئے۔ خالق نقطہ نظر سے اجسام کی مرئیت اور لمسیت کے لیے آگ اور مٹی کا ظہور ہوا۔ ان کے بعد ان کے درمیان واسطے کی ضرورت ہوئی۔ پانچ باقاعدہ اجسام میں سے چار آگ، پانی، مٹی اور ہوا کی اساس ہے۔ یہ اجسام نہایت باریک قائم الزاویہ مثلثوں سے بنے ہوتے ہیں۔ جب عناصر ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں جو فقط تین اعلیٰ عناصر میں ممکن ہو سکتا ہے تو وہ مثلثوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور پھر ان میں سے جدید صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ ہر عنصر کا ایک فطری مقام ہے جس کی طرف وہ ساعی رہتا ہے۔ کائنات کی تمام ممکنات کے مجموعے سے بھرپور ہے۔

افلاطون کائنات کو ایک مکمل کرہ تصور کرتا ہے زمین اس کے نزدیک ایک ٹھوس کرہ ہے جو عالم کے وسط میں واقع ہے۔ ثوابت اور سیارے برجوں اور حلقوں میں

جڑے ہوئے ہیں جن کی گردش کے ساتھ وہ گھومتے ہیں۔ جب تمام ستارے اپنے اصلی مقام پر واپس آجاتے ہیں تو ایک کونی سال ختم ہوتا ہے جس کی مدت دس ہزار برس ہے۔ ستارے معقول اور مسعود مخلوق ہیں۔ یہ مرئی دیوتا ہیں اسی طرح کل کائنات ایک محسوس ہے جس کے اندر تمام دیگر مظاہر داخل ہیں۔ یہ مخلوقات میں سے کامل ترین وجود ہے اور فوق الاحساس وجود کا عکس ہے۔

افلاطون کی نظر میں روح انسانی روح کائنات کی ہم جنس ہے جس میں سے وہ نکلی ہے۔ روح بسیط اور غیر جسمی ہے وہ اپنی ذاتی حرکت سے جسم کو حرکت دیتی ہے۔ تصور حیات اس کا جدلیاتی ہے اس لیے اس کا نہ کوئی آغاز ہو سکتا ہے اور نہ انجام۔ چونکہ روحیں جسم خاکی کے اندر ایک اعلیٰ عالم سے اتر کر آئی ہیں اس لیے اگر یہاں پر ان کی زندگی پاکیزہ رہتی ہے اور ان کے مقاصد بلند رہے ہیں تو وہ موت کے بعد پھر عالم بالا کی جانب عود کر جاتی ہیں اور جن کو اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے کچھ ایک دوسرے عالم میں جاکر سزا پاتی ہیں اور کچھ حیوانوں اور انسانوں کے جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ پچھلی زندگی میں روح تصورات کو دیکھ چکی ہے اس لیے اس زندگی میں محسوسات کو دیکھ کر جو تصورات کی نقلیں ہیں اس کو تصورات یاد آجاتے ہیں۔ اس کے خیال میں عقل روح کا اعلیٰ اور غیر فانی حصہ ہے جسم میں ہونے کے بعد روح ایک فانی حصہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے اس فانی حصے کے بھی دو شعبے ہیں ایک شجاعت اور دوسرا شہوات۔ عقل کا مقام سر کے اندر ہے شجاعت کا مقام قلب کے اندر اور شہوات کا مقام جسم کے نیچے کے حصے میں ہے۔

فلسفہ مثالیت

یونانی ابتدائی فلسفے کا دور انیکسے گورس پر ختم ہوا جس میں کائنات کی تشریح اور وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی۔ یونانی فلسفے کا دوسرا دور سوفسٹس سے شروع ہوا جس میں کائنات میں انسان کی حیثیت دریافت کی گئی۔ سوفسطائیوں کی گمراہ کن تعلیمات کے دور میں سقراط منظر عام پر آیا اور اپنے اقتصادی نظام میں برملا کہا کہ "اگر انسان سمجھے تو رہنے کے لیے ایک چھوٹا سے مکان' کھانے کے لیے سادہ غذا اور پہننے کے لیے عام کپڑوں کی ضرورت ہے اور اس کی یہ تمام ضروریات حکومت اسے بہم پہنچائے اور فرد اس کے بدلے میں اپنے پیشے کو پوری دلجمعی اور شوق سے کرے کیونکہ معاشرے کا ہر فرد اپنے ذہنی رجحان کے مطابق کوئی نہ کوئی کام معاشرے کی خدمت کے لیے سرانجام دے گا تب ہی ریاست سے اپنی بنیادی ضروریات حاصل کرنے کا حقدار ٹھہرے گا۔ ریاست کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو عاقل و دانا اور منصف مزاج ہوں۔ حقیقی علم کی بنیاد عقلی استدلال اور ذہنی شعور ہے اور کسی چیز کا ایک خاص تصور ہی عقلی استدلال کی بنیاد ہے اور ایک عالم کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ نیکی ایک علم ہے لہٰذا اسکھایا پڑھایا جا سکتا ہے۔ نیکی کی تمام قسمیں علم سے نکلتی ہیں اور تمام اخلاقیات علم سے جنم لیتے ہیں۔"

سقراط کے بعد افلاطون (429 ق م) نے اپنی تھیوری آف آئیڈیاز میں کہا کہ "انسانی علم کے دو ذرائع ہیں۔ ایک حواس خمسہ کے افعال اور دوسرا عقلی استدلال۔ حواس خمسہ سے مادی دنیا کی اشیاء کا تجربہ حاصل ہوتا ہے اور عقلی استدلال سے عمومی یا آفاقی تصورات و خیالات کا ادراک ہوتا ہے اور خیالات و تصورات کا جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود ہے جبکہ حواس خمسہ کا جہاں عدم وجود ہے۔ خیالات اشیاء میں پنہاں

ہیں اور آفاقی تصورات وجود اور عدم وجود کے درمیان میں ہیں، کسی چیز کا آفاقی تصور ایک ہوتا ہے۔ خیال زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے جبکہ مادی اشیاء زمانی بھی ہیں اور مکانی بھی۔ خیال دائمی اور غیر متغیر ہے جبکہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ تصورات کی تین اقسام ہیں۔ اخلاقی تصورات جیسے انصاف، نیکی اور خوبصورتی۔ مادی اشیاء کے تصورات جیسے گھوڑا، انسان، درخت وغیرہ خصوصیات یا صفات کے تصورات جیسے بہادری، ہمدردی وغیرہ۔ نیکی کے اوصاف بدی اور انصاف کے ساتھ بے انصافی کا تصور موجود ہے۔ جس طرح ایک آفاقی تصور اپنے جیسی بہت سی چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک بلند تر تصور اپنے سے چھوٹے تصورات کی نمائندگی کرتا ہے۔ تمام تصورات مل کر ایک سب سے بڑے تصور کے تحت آتے ہیں اور یہ سب سے بڑا یا بڑا ترین تصور ایک ہے، حتمی ہے، ایک مکمل حقیقت ہے، ایک ہونے کا جواز ہے اور پوری کائنات کے ہونے کا جواز بھی سب سے بڑا تصور یا خیال ہے۔ کسی جسمانی شکل میں پیدائش سے قبل انسانی روح بے جسم تصورات و خیالات کی دنیا میں سوچ بچار کے عالم میں تھی لیکن جیسے ہی وہ انسانی جسم میں داخل ہوئی حواس خمسہ میں مدغم ہو کر وہ اس جہان میں کسی خوبصورتی کو دیکھتی ہے تو اسے خوبصورتی کے اس ایک تصور کی یاد آتی ہے جو خیالات کی دنیا میں تھا اور جب روح ایک کے بعد دوسری خوبصورتی کو دیکھتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تو اس خوبصورتی کے ایک خاص تصور والی خوبصورتی ہے جو اپنے آپ کو ان خوبصورت چیزوں میں پیش کر رہی ہے۔ خوبصورت اجسام کے بعد روح خوبصورت ارواح اور پھر خوبصورت علوم کی طرف متوجہ ہو کر خوبصورتی کے ایک تصور کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور یہ جذبہ انسان میں اس لیے موجود ہے کہ وہ عقلی استدلال کی صفت سے متصف ہے۔"

افلاطون کے نزدیک طبیعات کا تعلق مادی دنیا کے مظاہر فطرت سے ہے وہ دنیا کی تحقیق کا فلسفہ بیان کرتے ہوتے کہتا ہے کہ "حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء

آفاقی تصورات کی نقل یا عکس ہے۔ آفاقی خیالات اصل وجود اور حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء نیم حقیقی یا عدم وجود ہیں اور عدم وجود کا حتمی اصول مادہ ہے جسے آفاقی تصورات نے چیزوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ خدا نے سب سے پہلے دنیا کی روح کو تخلیق کیا جو غیر مادی ہونے کے باوجود جگہ گھیرتی ہے۔ اس نے اس روح کو جال کی طرح خلا میں پھیلایا پھر اسے اندرونی اور بیرونی حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ دونوں حصے نصف دائرے کی شکل میں ہیں اور ان کا مقدر یہ ہے کہ سیاروں اور ستاروں کے دائرے بن جائیں پھر وہ مادہ لے کے اسے چاروں عناصر سے روح کے خالی ڈھانچے میں باندھتا ہے جس سے کائنات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ انسانی روح بھی دنیا کی روح سے ملتی جلتی ہے اور یہی روح انسانی جسم میں حرکت کی وجہ ہے اور اسی دنیا میں انسان کا عقلی استدلال پنہاں ہے۔ انسانی روح کا تعلق آفاقی تصورات اور حواس خمسہ دونوں جہانوں سے ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے اور دونوں حصوں میں سے ایک حصہ پھر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اوپر والا حصہ عقلی استدلال والا ہے جو آفاقی تصورات کے جہاں کا ادراک کرتا ہے۔ روح کا عقلی استدلال والا حصہ غیر فانی ہے جبکہ غیر استدلالی حصہ فانی ہے اور یہ حصہ نیکی اور بدی میں تقسیم ہے۔

افلاطون کو مثالیت پسندانہ فلسفہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ فلسفہ مجموعی طور پر عام اصولوں پر مبنی ہے۔ افلاطون کے مطابق موجودہ مادی کائنات اپنی ہیئت کے اعتبار سے حقیقی نہیں بلکہ اس حقیقی کائنات جو ماورائے کائنات میں حقیقت مطلقہ کی صورت میں موجود ہے کا عکس یا پرتو ہے۔ ٹھوس مادی ہیئت میں موجود کائنات موجودات صرف ماورائے کائنات میں موجود اصل حقیقت کی حد تک حقیقی اور اس حقیقت مطلقہ کا عکس ہیں اسی طرح دیگر موجودات بھی ماورائے کائنات میں موجود اصل مظاہرات کا عکس یا پرتو ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی روح ایک ایسی خارجی قوت ہے جو عرش سے پھوٹ رہی ہوتی ہے جو اپنی فطرت میں لافانی ہے اور اس کا تعلق اس حقیقی کائنات سے ہے جو ہمارے حواس سے بالاتر کہیں اور موجود ہے جس تک صرف عقل کے ذریعے رسائی ممکن

ہے۔ انسانی ذہن اپنی فطرت میں روحانیت کا حامل ہے۔ انسان روحانی لحاظ سے لافانی ہے اور اس لحاظ سے اس کا ذہن بھی لافانی ہے۔ انسان اپنے ذہن میں موجود غیر تغیر پذیر اور لازوال تصورات کے ذریعے اس حقیقت مطلق جو ماورائے کائنات موجود ہے کی ہیت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

افلاطون کے خیال میں تخلیق کائنات کا مبداء واحد کوئی نہ کوئی نفس، روح، خدا یا مطلق وجود ہے۔ یہ مظہری دنیا اصل اور حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ ہر لحہ تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی ہے اور یہاں عروج وزوال اور موت وزیست کا لامتناہی سلسلہ جاری وساری ہے۔ یہ کائنات عمومی طور پر اپنے اصل کی نقل ہے اور ہر مظاہر فطرت کا عین مطلق عالم بالا یا عالم مقام میں موجود ہے جو غیر متبدل اور غیر فانی ہے۔

کائنات اور اس کے مظاہر ایک بامقصد تخلیق ہے۔ فطرت کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے فطرت کے وسیع روحانی نظام کے پیچھے کسی ایسی ہستی کا وجود ضرور موجود ہے جو اسے باضابطہ، بے مثال، خودکار اور منظم نظام کے تحت چلاتی ہے اور وہ ہستی اسی جگہ موجود ہو سکتی ہے جہاں حقیقی کائنات ہمہ اپنے موجودات کے اپنے لاثانی اور لافانی فطرت میں حقیقت مطلق کی صورت میں موجود ہے۔ موجودات کائنات میں کوئی چیز اپنی فطرت اور ہیت کے بارے میں واضح معلومات نہیں رکھتی بلکہ صرف انسان اپنی عقل کے ذریعے ان کے بارے میں ایک واضح تصور قائم کرلیتا ہے۔

حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والا علم نامکمل اور غیر یقینی ہوتا ہے حقیقی، مستند اور پائیدار علم صرف اور صرف دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ دلیل ہی وہ دماغی قوت ہے جو حقیقت مطلقہ تک رسائی کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ اشیا اور موجودات کی اصل روحانی شکل کو ان کے مادی اظہار سے علیحدہ کرتی ہے۔ ہر دلیل کے پیچھے بلاشبہ عقل ہوتی ہے اور عقل ہی سچائی کو پرکھ سکتی ہے۔ انسانی عقل علم کے ذریعے معنی اور ترتیب تلاش کرکے موجودات کی نوعیت اور ان کی حقیقت کو خود پر عیاں کرتا ہے۔ یہی،

بھلائی، سچائی اور خوبصورتی کی حیثیت و نوعیت غیر متغیر اور ابدی ہوتی ہے یہ نہ تو تاریخی تواتر کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں اور نہ ہی مختلف معاشرہ میں نسل در نسل تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہیں۔ روحانی لحاظ سے یہ اپنی فطرت میں ابدی اور مسلسل غیر تغیر پذیر ہوتی ہیں اور ان کی تخلیق میں انسان کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ یہ اس روحانی کائنات کا حصہ ہیں جو ماورائے کائنات کہیں موجود ہے۔

ایک مثالی زندگی ایک مثالی معاشرے میں ہی ممکن ہوتی ہے اور ایک مثالی معاشرہ اس وقت تک تشکیل نہیں پا سکتا جب تک کہ مثالی اقدار اس کی بنیاد نہ بنے۔ انسانی زندگی اور وسیع تر کائنات کے روحانی نظام کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے اقدار سے آگاہی اور ان کی پاسداری ضروری ہے اس لیے معاشرے کے ہر فرد کو معاشرتی اقدار کی پاسداری کرنی چاہیے۔ برائی نہ صرف پورے معاشرے کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ کائنات کی ابدی روح کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ برائی ایک نامکمل اچھائی اور کائنات کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا نتیجہ ہے جسے صرف علمیاتی اور مابعد الطبعیاتی تصور کے اصولوں کو معاشرہ میں منطبق کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔

اقدار چونکہ حقیقی روحانی کائنات کا ایک حصہ ہے اس لیے انسان انہیں اپنانے پر مجبور ہے۔ حسن اپنی ہیئت میں وسیع روحانی نظام کی فطرت کا عکس ہے اور اسے کبھی بھی انسانی محسوسات کا خارجی اظہار نہیں سمجھنا چاہیے۔ افلاطون کے خیال میں عالم دو ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا حقیقی۔ عالم مثال حقیقی اور سکونی ہے جبکہ عالم ظاہری میں حرکت و تغیر ہے جو فریب نگاہ ہے، خیر مطلق فکر محض ہے، کائنات بامعنی ہے، موت کے بعد روح باقی رہتی ہے، حسن ازل کی کشش ارواح کو اپنے مبداء حقیقی کی یاد دلاتی رہتی ہے اور کائنات عقلیاتی کل ہے جس کی حقیقت کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک کائنات ازلی و ابدی ہے اور امثال اور مادہ ازل سے موجود ہیں۔ ہر مادی شے بالقوہ سے بالفعل ہوتی رہتی ہے فاعل کسی ہیئت کو خلق نہیں کرتا۔

فلسفہ سیاسیات

یہ سوال افلاطون کے زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ سیاسیات فلسفہ ہے، علم ہے یا محض ایک فن۔ اس کا جواب یہی ہے کہ سیاسیات مدبر کے لیے ایک فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے گہرا مطالعہ ناگزیر ہے۔ معاشرتی زندگی سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے سیاسیات ایک علم ہے جس کا مطالعہ اس کے فنی اور فلسفیانہ پہلو کو پختہ کر دیتا ہے۔ دل میں کلی اصلاح کا جذبہ رکھنے والے شخص کے لیے سیاسیات ایک فلسفہ ہے۔ سیاسی غور و فکر کا مرکز ریاست ہے اور ریاست کا مفہوم ہی دراصل فلسفے کی جان ہے۔ ریاست کی شکل ہر زمانے میں بدلتی رہی اور یونان قدیم میں وہ ایک شہر تک محدود ہوتی تھی۔

سیاسی فکر کے آغاز کا تعین بڑا دشوار ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی خاص یا مخصوص علاقے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لفظ Politics دراصل یونانی اصطلاح پولس (Polis) سے اخذ شدہ ہے جس کے معنی "شہری مملکت سے متعلق امور" کے ہیں اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی فکر کا باقاعدہ آغاز قدیم یونان سے ہوا تھا۔ یونان میں بیداری کی ابتدا ساتویں صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوئی جب کسان سونے اور چاندی کے سکے رائج ہونے کی وجہ سے بدحال ہوئے اور فوجی طبقہ کاشتکاروں پر چھا گیا۔ ساہوکاروں نے کسانوں کی زمینیں خرید لیں اور کاشتکاروں نے معاشی دشواریوں کے پیش نظر ان کی غلامی کو قبول کر لیا۔ اس نازک حالت میں "دولفی" کی غیبی آواز نے اخلاقی تعلیم شروع کی جس کا معاشرہ کے ہر طبقہ پر گہرا اثر پڑا اور اس تعلیم کے زیر اثر ایسے قانون ساز پیدا ہوئے جنہوں نے یونان کے

لیے سیاسی دستور مرتب کیے۔ ریاست تھیوری (Theory) کا آئین پروٹے گورس اور
یونان کی خاص ریاست ایتھنز کا آئین سولون (Solon) نے بنایا۔

یونان میں شہری ریاستوں کی ابتدا چھٹی صدی قبل مسیح میں اس وقت شروع ہوئی
جب معاشی انقلاب موثر ہو چکا تھا۔ سپارٹا میں ایک فوجی اشرافی حکومت قائم ہوئی جسے
لی کرگیس کے قوانین نے مزید مضبوط بناتے ہوئے کاشتکاروں کو زمینداروں کے عملاً غلام
بنا دیا۔ دوسری جانب ایتھنز کی ریاست میں سولن کے آئین نے جمہوریت کا بیج بویا۔ سولن نے
حتی المقدور معاشرے میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب
رہا۔ اس نے اپنی نظموں میں کہیں کہیں ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کو وہ بہتر سمجھتا تھا اور
جن کو اس نے ایتھنز کے دستوری قوانین بناتے وقت مد نظر رکھا تھا۔ اس نے کاشتکاروں کا
قرضہ منسوخ کر کے ان کو سکھ کا سانس لینے کا موقع دیا۔ ہر فرد کو اس بات کا حق دیا کہ وہ
محتاج اور بے بس لوگوں کی طرف سے عدالت میں انصاف طلب کرے۔ مقدمات کا فیصلہ
کرنے کے لیے ایک جیوری مقرر کی جس کا انتخاب عوام میں سے ہوتا تھا۔

سولن کے شہر چھوڑ جانے کے بعد اس کا رشتہ دار پی سس ٹرے ٹس چھوٹے
چھوٹے زمینداروں کی مدد سے ایتھنز کا بادشاہ بنا۔ اس نے ان زمینداروں کی مالی مدد کر کے ان
کی مالی مشکلات میں مزید کمی کی۔ اس نے وہ تمام ادارے قائم رکھے جو سولن کے آئین
کے مطابق معرض وجود میں آئے تھے۔ بعد میں کلائیس تھینز نے ریاست کی آبادی کو نئے
سرے سے اصولوں کے تحت تقسیم کیا اور کلیسا کو ملک کا فرمانروا بنا دیا۔ اس نے کلیسا کی
منتخب کردہ دس کمیٹیوں کو عملی اختیارات دے کر مکمل جمہوریت نافذ کی۔

اس دور میں سپارٹا میں شہریوں کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل تھا لیکن کھانا سب
ایک ساتھ کھاتے تھے اور ہر شہری کو اناج وغیرہ کی ایک خاص مقدار اپنے حصے کے طور پر
مہیا کرنا پڑتی تھی۔ شہری ایک خاص وردی پہنتے تھے اور ان کے کھانے کی چیزیں بھی مقرر
تھیں۔ کریٹ کے جزیرے میں تمام زمینیں ریاست کی ملکیت تھیں۔ ریاست ان پر کاشت

کروائی اور پیداوار شہریوں کے تصرف میں یکساں آتی تھی۔ ایتھنز کی ریاست چاندی اور پتھر کی کانوں اور جنگلوں کی مالک تھی اور اس میں شہریوں کی ملکیت پر ایک حد تک نگرانی رکھی جاتی تھی۔ مل کر کھانے اور زمین کی ملکیت میں شراکت کی پابندی تھیں تھی اور نہ ہی تعلیم دینا ریاست کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

سولن کے بعد فیثا غورث اور ای لوتیا کے فلسفیوں نے بہت سے ایسے اصول مدون کیے جن کا بعد کے آنے والے فلسفیوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ فیثا غورث نے ماہر ریاضیات ہونے کے باوجود ایک خاص فلسفہ حیات روشناس کروایا جس کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ "ایک عدد اس وقت تک سالم رہتا ہے جب تک اس کے اجزا برابر ہیں۔ ریاست کی بنا انصاف پر اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے اجزا میں مساوات ہو اور انصاف کا مقصد مساوات کا قائم رکھنا ہے۔ انسان کی تین قسمیں ہیں عقل پرست شہرت پرست اور دولت پرست اور یہ تینوں قسمیں معاشرے اور ریاست کے اجزا ہیں۔" ہیریک لی ٹس نے کہا کہ "انسان کو اپنی زندگی قانون کے مطابق بسر کرنا چاہیے تمام انسانی قوانین ایک قانون الٰہی پر مبنی ہوتے ہیں"۔ سوفسطائی پروٹے گورلیس نے خیال ظاہر کیا کہ "ریاست کی بنیاد اور اس کے قائم ہونے کی محرک انسانی ضروریات ہیں۔ ادب اور اخلاق کے اصول خدا کی طرف سے براہ راست نازل ہوتے ہیں اور ان کے بغیر ریاست کی حیثیت افراد کے ایک مجموعے سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور اس کا مقصد صرف انسانی زندگی کی ادنیٰ ضرورتوں کو رفع کرنے تک محدود رہتا ہے۔ ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور ریاست قانون کے ذریعے سے سیاسی اور اخلاقی زندگی کو بہترین شکل دیتی ہے۔" سوفسطائی فے لی نے کہا کہ "تمام سیاسی دشواریوں کی وجہ معاشی بد نظمی ہے" سوفسطائی ہپوڈے مس نے خیال ظاہر کیا کہ "آبادی کو کسان دستکار اور سپاہی کے تین طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے اور حاکموں کے انتخاب کا حق ان تینوں طبقوں کو یکساں ہونا چاہیے۔ مزید ان زمین کو بھی تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے ایک وہ جو کسان کی ذاتی ملکیت ہو۔ دوسری وہ جو ریاست کی ملکیت ہو جس سے سپاہی

طبقے کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور تیسری وہ جو مذہبی اغراض کے لیے وقف ہوں۔"

ایتھنز کی جمہوریت کا نصب العین 441ق م میں سپارٹا کی جنگ کے آغاز تک قائم رہا لیکن جلد ہی لوگ بے اصولی اور بے غرضی کی طرف راغب ہو گئے۔ سقراط اور افلاطون ایتھنز کی سیاسی اور اخلاقی تنزلی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "تنزلی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایتھنز کے لوگوں کو اخلاق و معاشرت کا صحیح علم حاصل نہ تھا جب تک ان کی ذہنیت پر ان کے رہبروں کی روایات اور قدیم اخلاقی تعلیم کا اثر رہا وہ سنبھلتے رہے لیکن ایرانی جنگوں میں فتح یاب ہونے کے ساتھ ہی عقلیت کا دور شروع ہوا اور عقل کی پرستش میں لوگ اس آئین حیات کو بھول گئے جس نے اس وقت ان کی راہنمائی کی تھی۔ چنانچہ یونان کی سیاسی اور اخلاقی زندگی میں انتشار پیدا ہوا اور ایک صدی کے اندر اندر نہ صرف ایتھنز کی عظمت خاک میں مل گئی بلکہ تقریباً یونان کی تمام شہری ریاستیں تباہ ہو گئیں۔"

ایتھنز کے بگڑے ہوئے سیاسی اور اخلاقی فلسفے کے خلاف سب سے پہلے سقراط (470-399ق م) نے بغاوت کی اور کہا کہ "قانون کی پیروی ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے اور قانونی سزا سے گریز کرنے کا اس شخص کو بھی حق نہیں ہے جسے یقین ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔ مدبری ایک فن ہے جس میں بغیر استعداد اور تعلیم کے مہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ریاست اور سیاسی زندگی کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ایسی شخصیتیں جن کا علم اور عمل کامل ہو اس کی رہبر اور حکمران بنائی جائیں۔ سیاسی قابلیت کوئی لوتی چیز نہیں جس کا ہر کس و ناکس ہر درزی اور قلعی گر دعوے دار ہو سکے۔ ریاست کا کام ماہرین سیاست کے بغیر نہیں چل سکتا ہے اور سیاسی زندگی کی اصلاح ان لوگوں کے بغیر ممکن نہیں جو ہر علم و ہنر اور اخلاقی صفت میں کامل ہوں۔ ناجائز طرز عمل اور وہ زیادتیاں جو بے اصول حکمران کرتے ہیں ان کی ذات کو بھی اتنا ہی صدمہ پہنچاتی ہیں جتنا اوروں کو۔ سیاسی اقتدار ان ہی لوگوں کا حق ہے جو اس کی ذہنی اور جسمانی استعداد رکھتے

ہیں۔ صرف فائدہ حاصل کرنے کو زندگی کا مقصد بنانا ایک انتہائی ادنیٰ معیار ہے۔"

سقراط کے بعد افلاطون نے اپنی تصنیف "الجمہوریہ" میں اخلاقی، فلسفیانہ، مافوق الطبعی، مذہبی، تعلیمی، نفسیاتی اور تاریخی عقیدوں کی آمیزش سے ایک ایسا فلسفہ حیات مرتب کیا جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل کے لیے رہبری کی حیثیت رکھتا ہے۔ افلاطون کے مطابق "ریاست کا قیام اس وجہ سے عمل میں آیا کہ انسان خود اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ ابتدائی شکل میں ریاست صرف ایک بستی ہوتی ہے۔ جس میں کاشتکار اور مختلف قسم کے دستکار آباد ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں محض آسودگی مدنظر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ حفاظت کی ضرورت سپاہیوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیتی ہے جس میں جسمانی خواہشوں کے علاوہ اوالعزمی اور جوش کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے سپاہیوں میں ایسے افراد سامنے آتے ہیں جن میں دیگر اوصاف کے علاوہ عقل اور غور کا مادہ بھی ہوتا ہے اور جن کی شخصیت سب سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ حکومت کرنے کا حق ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کا پہلا اصول معاشرے کے تین طبقے ہیں اور ہر طبقے کے سپرد وہ کام کیا جانا چاہیے جس کی وہ اہلیت رکھتا ہو۔ اس اصول پر عمل کر کے ہر شخص اپنی سرشت کے مطابق سکون، آسودگی اور اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔"

افلاطون کے نزدیک "ریاست میں کامل ربط اور اتحاد 'دانائی، ہمت اور اعتدال کے عناصر کو عدل کے ذریعے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور اگر افراد کمال حاصل کرنا چاہئیں تو انہیں بھی اپنی طبیعتوں میں عدل کے ذریعے توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ ریاست میں کاشتکار اور دستکار جسمانی خواہش، سپاہی ہمت اور محافظ عقل جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاست کو چاہیے کہ نچلے طبقے کی ذہنی پرورش اس عقیدے سے کی جائے کہ خدا نے محافظوں کو سونے سے، سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے اور نچلے طبقے کا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے بہتر عناصر کی اطاعت کرے۔ محافظوں اور سپاہیوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اعلیٰ مرتبے کا حق ادا کر سکیں۔"

افلاطون نے ادب میں موسیقی اور جسمانی نشو و نما میں غذا اور حفظان صحت کے اصولوں کی تعلیم کا اضافہ کیا۔ محافظ بننے کے لیے سترہ سال کی عمر کے بعد دس سال تک ریاضیات، ہیت اور پانچ سال تک فلسفے کی تعلیم ضروری قرار دی۔ محافظوں کے لیے پندرہ سال تک حکومت کرنا لازم قرار دیا۔ محافظوں کی تعلیم کے لیے اس نے اور بہت ساری تجاویز پیش کیں جو اشتمالیت کے نام سے مشہور ہیں۔ اس نے اپنے نظام حیات میں کاشتکاروں کو تعلیم سے اور سپاہیوں اور محافظوں کو ان لذتوں سے ناآشنا رہنے پر مجبور کیا جو کاشتکاروں کے حصہ میں آئیں۔ اس نے تعلیم میں مرد اور عورت میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا اور دونوں کے لیے ایک ہی نصاب مرتب کیا۔ اس کے نظام حیات میں مرد یا عورت کوئی بھی محافظ بن سکتا ہے۔

افلاطون نے صحت مند اور تندرست اولاد پیدا کرنے کے لیے یہ اصول بنایا کہ سپاہیوں اور محافظوں کے طبقوں میں سے ان مردوں اور عورتوں کے عارضی نکاح کر دیئے جائیں جو جسمانی اور روحانی خوبیوں کے لحاظ سے شہریوں کے اعلیٰ نمونے ہوں۔ پیدائش کے وقت بچہ ماں سے جدا کر دیا جائے تاکہ کسی ماں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا بچہ کون سا ہے۔ اس کے مطابق اس لاعلمی سے ہر ماں کی نظر میں وہ تمام بچے جن کی پیدائش کا زمانہ ایک ہوگا یکساں عزیز ہو جائیں گے۔ نکاح صرف عمر، صحت اور طبیعت کے لحاظ سے باہم مناسبت سے ہوگا۔ مرد و عورت کی یک جائی کی اجازت محافظ کی مرضی سے ہوگی اور وہ اولاد جن میں ذرا برابر نقص ہو تلف کر دی جائے گی۔ ریاست کی آبادی میں تناسب سے زیادہ اضافہ اور نکاحوں کی تعداد کو ایک خاص حد تک محدود کرنے کی ذمہ داری محافظوں پر ہوگی۔ شادی کے دس سال بعد تک میاں بیوی کو تجربہ کار عورتوں کی نگرانی میں رکھا جائے گا۔

افلاطون کے نزدیک شہروں بلکہ نوع انسانی کو اپنے مصائب سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں

فلسفے کی روح اور فلسفے کی قوت نہ آجائے۔ افلاطون کی دوسری تصانیف "مدبر" اور "نوامیس" ہیں۔ مدبر میں فلسفی کی جگہ "مدبر" لے لیتا ہے۔ اس کے نزدیک "مدبر میں فلسفی کی تمام صفات اور عملی علوم پر فضیلت حاصل ہونی چاہیے۔ مدبر کو اپنے ماتحتوں پر کام اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ اسے قانون کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔"

یونان میں عام طور پر ریاستوں کی پانچ قسمیں بادشاہت، مطلق العنانی بادشاہت، اشرافیہ، چند سری اور جمہوریت مانی جاتی تھیں۔ افلاطون نے ان میں عینی بادشاہت اور بے آئینی جمہوریت کا اضافہ کیا۔ اس کے نزدیک تین طرح کی حکومتیں دستوری بادشاہت، اشرافیہ اور معتدل جمہوریت قانونی ہیں۔ عینی باشاہت کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اس کے بعد بادشاہت ہے جبکہ جمہوریت بنبری ریاستوں میں غنیمت اور قانونی ریاستوں میں سب سے کم تر ہے۔

افلاطون کے نزدیک "ملکیت کا حق سب کا ہے لیکن اس پر ریاست کی نگرانی ہونی چاہیے۔ شہریوں کو جو زمین دی جائے اس کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا حصہ سرحد کے پاس ہونا چاہیے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ دولت پیدا کرنے سے روکے اور دست کاری اور تجارت ریاست کی نگرانی میں غیر ملکیوں کے سپرد کرے ۔ عورتوں کو سیاسی حقوق کی تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرے اور ہر شخص کو مرضی یا پسند کی شادی کرنے سے روکے۔"

افلاطون کے نزدیک وہ دستور زیادہ پائیدار ہوتا ہے جس میں حکومت کے مختلف اصولوں کی آمیزش ہو اور اس بنا پر جمہوریت کی ایک ایسی آمیزش کا تصور پیش کرتا ہے جس میں دانائی اور آزادی دونوں شامل ہوں۔ اس نے حاکموں کی کارگزاری کی جانچ پڑتال کے لیے محتسبوں کی انجمن اور شہریوں کے اخلاق کی نگرانی کے لیے مجلس شبینہ تجویز کیں۔

افلاطون کے نزدیک "سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا کی وحدت اور اس کی

قدرت کاملہ پر یقین رکھا جائے۔ حقیقی اطاعت کے لیے لازمی ہے کہ شہری اپنے قانون کی دل سے قدر کریں اور ان کی مرضی حکومت کی مرضی کے تابع ہو۔ قانون میں اس وقت تک تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے جب تک تمام حاکم' تمام شہری اور تمام غیبی آوازیں اس پر متفق نہ ہوں۔ قانون کے مطابق سزا دینے کا مطلب سزا پانے والے کی نیکی میں اضافہ یا بدی میں کمی ہوتا ہے۔"

نوامیس میں وہ تعلیم کے اصول بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بچوں کی تعلیم گھوارے سے شروع کرنی چاہیے اور گھوارے سے ہی تعلیم ریاست کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔ تین سال کی عمر سے ورزش شروع کی جائے۔ چھ سال کی عمر میں سکول داخل کروایا جائے۔ ہر ضلع میں الگ سکول ہونا چاہیے اور سکولوں کے ساتھ ورزش گاہیں اور کھیل کے میدان ہونے چاہیں۔ سکول میں چار سال تک ابتدائی تعلیم دی جائے جس میں گھوڑ سواری' تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھانا چاہیے۔ دس سال سے تیرہ سال تک ادب اور تیرہ سے سولہ سال تک موسیقی کی تعلیم دینی چاہیے۔ شادی کی اجازت پچیس برس تک نہیں ہونی چاہیے۔"

افلاطون نے قدیم یونان کے استحکام کے لیے ایک مستحکم سیاسی نظام اور اس کے ادارت سے متعلق مثالی تصورات پیش کیے جو بالآخر یونانی معاشرتی عدم استحکام' متزلزل سیاسی حالات اور مختلف طرزہائے حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔ اس کا تصور مثالی مملکت اس وقت کے سماجی حالات کی بہتری اور لوگوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کے لیے ایک انفرادی فکری کوشش تھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی مثالی مملکت کے تصور کی اساس پر نہ صرف یونان نے سیاسی نظام اور ادارت کی بنیاد رکھی بلکہ انقلاب فرانس کے بعد تمام مغربی مملکتوں نے افلاطونی فلسفہ سیاسیات کی بنیاد پر سیاسی زندگی اپنائی اور آج بھی مغربی دنیا میں اس کے فلسفہ سیاست کے بہت سارے اصول کار فرما ہیں۔

افلاطون نے اہل یونان کو سوفسطائی نظریات کے باعث برپا ہونے والی اخلاقی پستی سے نکالنے کے لیے ایک ضابطہ اخلاق کی ضرورت پر زور دیا جو ہر جگہ اور ہر وقت قابل عمل ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مملکت کا اخلاقی مقصد متعین کرتے ہوئے کہا کہ "مملکت کا ایک اخلاقی وجود ہے جس کے لازمی اجزا افراد ہیں جنکی اخلاقی نشو نما صرف مملکت کے مستحکم سیاسی نظام کی بدولت ممکن ہے" اس کے سیاسی فلسفہ کا بنیادی مقصد مثالی مملکت کی تنظیم و تعمیر کے علاوہ حقیقی اچھائی اور نیکی کا حصول ہے۔

افلاطون نے الجمہوریہ میں سیاستدان اور دی لاز میں ایک عقلی اور اخلاقی استدلال پر مبنی خیالی ریاست کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہی دراصل ایک حتمی' ایک سیاسی اور آفاقی تصور پر مبنی ریاست کا خاکہ تھا۔ جس کا بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ریاست کی حکومت سے سطحی قسم کے امراء جو علم سے نابلد ہونے کے باوجود اپنی دولت اور جائداد کے باعث حکومتی عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں کو علیحدہ کر کے ان کی جگہ ان عظیم لوگوں کو لایا جائے جنہوں نے اپنی زندگیاں فلسفے کے علم کے حصول کے لیے وقف کر رکھی ہیں اور ریاست کی ڈور ایک ایسے فلاسفر حکمران کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جس کی کوئی جائداد اور کنبہ نہ ہو اور اس میں علم' بہادری' اعتدال اور انصاف جیسے اوصاف موجود ہوں۔ چونکہ ایک حقیقی فلاسفر میں یہ چاروں اوصاف موجود ہوتے ہیں اس لیے وہ کاروبار حکومت کے ساتھ ساتھ رعایا کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ دے سکتا ہے۔ اس کے معاون ور فقا کار بھی چھوٹے درجے کے فلاسفر ہوں گے اور وہ بھی ذاتی اور شخصی جائداد و ملکیت سے آزاد ہونگے۔

افلاطون کا مشہور قول ہے کہ جب تک فلاسفر ریاستوں کے حکمران نہیں ہونگے تب تک معاشرتی یا سماجی برائی کا وجود ختم نہیں ہوگا اور اصل فلاسفر کی نشانی یہ ہے کہ اس کے آتے ہی ریاست کے اندر سماجی برائی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ افلاطون کے خیال میں ایک حقیقی فلاسفر کا کام فلسفے کی تشکیل و ترویج ہے۔ فلاسفر کے عمل میں غلطی کا قطعی

امکان نہیں ہوتا اور فلاسفر حکمران قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔وہ اپنے ذاتی شوق کی خاطر سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب جاہل اور نادان لوگ ریاست کی حکومت کا کاروبار درست طور پر نہ چلا سکیں اور عوام کی بھلائی کے قانون بنانے اور ان کی بھلائی کے اسباب پیدا کرنے میں ناکام ہو جائیں اور عوام ایسے جاہل امراء سے تنگ ہو کر فلاسفر کو ریاست کا کاروبار چلانے کے لیے مجبور کریں۔ایک اصلی سیاسی ریاست کے قوانین کی بنیاد عقلی اور اخلاقی استدلال ہے اس لیے اس ریاست کے قوانین صرف ایک فلاسفی بنا سکتا ہے۔حکومت کے اصل انتظامی اختیارات فلاسفروں کے ایک مختصر گروہ کو مناسب طریقے سے سونپے جا سکتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ریاست کے وجود میں آنے کی وجہ کو ریاست کے مقاصد میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔فرد کے کردار کی نشو و نما صرف ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے ہو سکتی ہے جو فرد کی تربیت کے ساتھ ساتھ اسے ایک اچھے شہری کے کردار میں ڈھالتا ہے۔انسانی زندگی کا نصب العین نیکی دانائی اور علم کا حصول ہے تاکہ سماجی انصاف کی پہچان ہو سکے اور معاشرے کے افراد کو ایک ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے یہ نصب العین حاصل ہو سکتا ہے۔ریاست کی حکومت کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔اول ریاست کے شہریوں کی تربیت کرنا اور انہیں دانائی اور علم کے زیور سے آراستہ کرنا تاکہ وہ نیکی کے جذبے اور اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں اور سماجی انصاف کا حصول ممکن ہو سکے۔دوم ریاست کے عوام کی مادی بھلائی ہے جو صرف اس صورت میں پورا ہو سکتی ہے جب ریاست کی حکومت اپنے پہلے فرض کی ادائیگی میں پوری طرح کامیاب ہو جائے۔

افلاطون اپنی خیالی ریاست میں تمام لوگوں کو چار طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست کا سب سے اہم طبقہ ریاست کی حکومت ہے اور حکومت کا سب سے اہم حصہ ایک فلاسفر حکمران اور اس کے قریبی معاونین ہیں جسے سرپرست یا محافظ گروہ کا

نام دیا گیا ہے اس کے اس طبقہ کو ذاتی جائیداد رکھنے یا دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں ہو گی ان لوگوں کو ریاست کی طرف سے سالانہ وظیفہ یا تنخواہ ملے گی جو ان لوگوں کی سال بھر کی عمومی ضروریات کے لیے کافی ہو گی۔ ان لوگوں کی رہائش اور خوراک بھی ریاست ہی کی طرف سے ملے گی۔ یہ طبقہ ایک ہاسٹل میں مل کر رہے گا اور میس میں اکٹھا کھانا کھائیں گے۔ ان کے فرائض میں ریاست کا روز مرہ کا کاروبار چلانا' عوام کی اخلاقی تربیت' مادی ترقی اور ریاست کی اجتماعی ترقی کے لیے منصوبہ بندی شامل ہونگے۔ ریاست کی حکومت کے احکامات کی تعمیل اور قوانین کے نفاذ کے لیے سول انتظامیہ ہو گی جو معاون طبقہ (Auxiliaries) ہو گا۔ اس طبقہ میں بھی اقتصادی کمیونزم رائج ہو گا۔ ریاست کے دفاع کے لیے تیسرا طبقہ (warriors) فوج پر مشتمل ہو گا یہ حکومت کے حکم پر پولیس کے فرائض بھی ادا کرے گا۔ اس کے ذمہ ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانا اور ریاست کے اندر امن وامان قائم رکھنا ہو گا۔ اس طبقہ کے لیے بھی اقتصادی کمیونزم ضروری ہے۔ ریاست کے چوتھے طبقہ میں ایسے شہری شامل ہیں جنکی ذہنی و جسمانی صلاحیت بہت کم ہے یا وہ ذہنی طور پر کوئی بڑے درجہ کا کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ طبقہ کسانوں اور دوسرے کاریگروں پر مشتمل ہو گا۔ اس طبقہ پر اقتصادی کمیونزم کا اطلاق نہیں ہو گا۔ بلکہ اس طبقہ کو ذاتی جائداد اور دولت رکھنے کی اجازت ہو گی۔ ان لوگوں کو اپنے ذاتی مکانوں میں اپنے خاندانوں کے ساتھ رہنے اور اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کام کرنے کی مکمل اجازت ہو گی اور یہ لوگ اپنی روزی اور رہائش کے خود ذمہ دار ہونگے لیکن ریاست کی حکومت ان لوگوں کی بھی پوری سر پرستی کرے گی اور یہ لوگ ریاست کے آزاد شہری ہونگے۔

افلاطون نے اپنی خیالی ریاست کے لیے تعلیمی نصاب' اقتصادیات' جسمانی ورزش اور مذہبی رسوم پر مبنی ایک خاص تعلیمی نظام پیش کیا ہے۔ ان تعلیم کے نصاب کے ابتدائی حصے میں دو قسم کے مضامین ہیں اور ابتدائی تعلیم کا یہ حصہ پانچ سال سے

بیس سال کی عمر تک کے لیے مخصوص ہے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں ریاست کے تمام شہریوں کو حصے لینے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ تعلیم مفت اور اس کا انتظام کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے پہلے درجے کے لیے موسیقی اور شاعری ذہنی ورزش اور جسمانی نشونما کے لیے مخصوص ہے دوسرے درجے میں حساب' جیومیٹری اور فلکیات بشمول جغرافیہ کی تعلیم دی جائیگی جو دس سال کے عرصہ پر مشتمل ہوگا۔ کامیاب طلباء کو تیسرے درجے میں خالص فلسفہ اور عقل جدلیات کی تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ دنیا کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والے طلباء کو پھر اگلے دس یا پندرہ برس کے لیے حکومت کی گارڈین کلاس کے ماتحت تجربہ حاصل کرنا ہوگا اور اس سخت اور مشکل تعلیمی مرحلے میں کامیاب طلباء بذات خود فلاسفر بن چکے ہونگے اور مستقبل میں ریاست کی باگ ڈوڑ سنبھالنے کے قابل ہونگے۔ افلاطون کے اس نظام تعلیم میں عورتوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔

افلاطون کی خیالی ریاست میں پہلا درجہ پاس کرنے اور دوسرے درجے میں فیل ہونے والے فوج اور سول سروس کے چھوٹے درجے کے ملازمین' دوسرے درجے میں پاس اور تیسرے درجے میں فیل ہونے والے اپنے ذہنی رجحان کے مطابق فوج اور سول سروس کے آفیسر بنتے ہیں' جبکہ تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والے حکمران جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ریاست کے چاروں طبقوں میں انسان کی فطری و جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر درجہ بندی کی گئی ہے۔ ریاست میں حکمران سے عام شہری تک سماجی طور پر ایک حیثیت کے حامل ہیں اور یہ سب ریاست کے عزت دار شہری ہیں اور ریاست کی ترقی کے لیے ہر شہری اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے مطابق اپنے لیے ایک پیشہ منتخب کرتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک نیکی کا مطلب محض نیک ارادہ نہیں بلکہ اس کے لیے کسی شے کے صحیح یا غلط ہونے کا علم بھی ضروری ہے۔ نیکی یا فضیلت علم ہے اور یہ علم وجدانی

فیصلے بعض اوقات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ صحیح راہ عمل کے تعین کا انحصار خود انسان کے اچھائی کے تصور پر ہے اچھائی وہ ہے جس پر صحیح عمل کا انحصار ہو جو دوسروں کو سکھائی جا سکتی ہو اور جو وجدانی نہ ہو۔ مثالیت چونکہ حقیقت ہے اس لیے تبدیل نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے مادی دنیا ماورائے کائنات میں موجود مثالی دنیا کا عکس ہے۔ فطرت آزاد وجود نہیں رکھتی بلکہ تخلیق انسانی ذہن کا ایک اسلوب ہے۔ ذہن انسانی حقیقت مطلق تک رسائی کا اہم ذریعہ ہے۔ دلیل پر مبنی علم ہی حقیقی علم ہے۔ اقدار اپنی ہیت میں لبدی اور غیر تغیر پذیر ہیں۔ دنیا کی ہر شے اس حقیقت مطلق کا عکس ہے جس کا تصور ہمارے ذہن میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے لہٰذا تصور ہی حقیقت ہے۔

افلاطون مثالی مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مملکت کا حقیقی مقصد عدل یا انصاف ہے جس کی بدولت ایک نیک اور مثالی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ عدل ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے اور اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی صلاحیتوں اور ذہنی استعداد کے مطابق فرائض سونپے جائیں اور وہ طبقے یا افراد ان متعین کردہ فرائض کو اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے انجام دیں۔ مثالی مملکت وہی ہو سکتی ہے جس میں اچھائیوں کو فروغ 'انصاف کی تکمیل کائنات کے ہمہ گیر روحانی نظام کے تحت موجودات کی حقیقت جاننے کی جستجو اور نیکی کے حصول کے لیے عملی جدوجہد ہو۔

افلاطون کے نزدیک مملکت اور فرد ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں۔ مثالی مملکت کے تین طبقات انسانی ذہن کے خارجی اظہار کی عکاسی کرتے ہیں خصوصاً اس وقت جب وہ معاشرتی لحاظ سے عمل پیرا ہوں۔ سب سے ابتدائی کردار اشتہا (Appette) ادا کرتا ہے اور اس کا خارجی اظہار معاشی طبقے کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ انسان کی بہت ساری مادی خواہشات مثلاً غذا 'لباس' رہائش وغیرہ فرد واحد پورا نہیں کر سکتا خوراک کے لیے کسان ' مکان کے لیے معمار اور لباس کے لیے کپڑا بننے والے کا تعاون ضروری ہے۔ اسی طرح مملکت اور معاشرے کے لیے بھی باہمی تعاون ضروری ہے جس سے معاشی ضروریات کے

ساتھ ساتھ فرائض کی تخصیص سے مداخلت بے جا کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا کردار حوصلہ (Spirit) ہے۔ جیسے جیسے انسانی ضروریات بڑھتی گئیں مملکت کے حدود میں توسیع اور دیگر وسائل میں اضافہ کے لیے دوسرے علاقوں کو فتح کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ اس کام کے لیے فوجی طبقہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا جو انسانی ذہن کی درجہ بندی کے لحاظ سے خارجی اظہار کے تحت حوصلہ کا حامل ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں فطری طور پر مضبوطی، فوجی صلاحیتیں اور حوصلہ و جذبہ ہوتا ہے۔ مدافعاتی کاروائی کے لیے اس طبقہ کی باضابطہ تربیت ضروری ہے۔

عقل (Reason) وحدت کا حامل عنصر ہونے کے باعث مثالی مملکت کی تشکیل میں کلیدی اور لازوال کردار ادا کرتی ہے۔ عقل کی بنیاد پر فرد میں سیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور علم کی بنیاد پر انسان محبت کرنا سیکھتا ہے۔ فلسفی طبقہ کو عقل کے ان دونوں پہلوؤں کا برملا اظہار کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ فلسفی حکمران رعایا پر حاوی نہیں ہیں۔ حکمران صرف مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں اور اصل مقصد مثالی مملکت کا استحکام ہے اور یہ استحکام انسانی ذہن کے خارجی اظہار کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے یہ مثالی سیاسی و سماجی نظام سہ طبقاتی نظام کہلاتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انصاف ایک مقصد ہے اور اس کی تکمیل معاشرہ کے لیے فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ انصاف کی تکمیل سے ہی مثالی مملکت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھائی چارہ اور اخوت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں سفالس (Cephalus) کا یہ تصور انصاف کہ "حقدار کو اس کے حق کے مطابق دیا جائے" ہر موقع پر قائم نہیں رہ سکتا اس لیے کہ حقدار کو حق دینا ایک Universal) (Thought ہے انصاف نہیں۔ اسی طرح پولی مارکس (Pole marchus) کے اس تصور انصاف کہ "دوستوں کے ساتھ اچھائی کی جائے ان کو فائدہ پہنچایا جائے اور دشمنوں کو نقصان" پر تنقید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انصاف کا تعلق انسانی روح سے ہے اور وہ

ایک داخلی عمل اور غیر معقول ہے اس لیے یہ کسی حد تک درست ہے کہ دوستوں کے ساتھ اچھائی کی جائے اور ان کو فائدہ پہنچایا جائے لیکن دشمنوں کے ساتھ دشمنی کرنا اور ان کو نقصان پہنچانا کسی بھی لحاظ سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ یہ اس شخص کی کم ظرفی ہے جو دشمن کے ساتھ ظلم یا برائی کر رہا ہے دراصل ایسا کرنے سے وہ دشمن کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہوتا ہے بلکہ وہ بنیادی طور پر اپنے اوپر ظلم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو برا کر رہا ہوتا ہے جس سے کسی کو بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ تھریسے ماکس (Thrasaymacus) کے اس نظریہ انصاف کو کہ "انصاف طاقتور کا حق ہے کسی بھی برسراقتدار حکومت کے قوانین اور ضابطوں پر عمل کرنا افراد معاشرہ کے لیے فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے" کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تصور انصاف جبر پر مبنی ہے اس لیے اس کے ذریعے نہ تو انسانی بہبود اور فلاح کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اخلاقی زندگی کو مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ اس تصور انصاف سے صرف ایک خاص طبقے کے مفادات کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اس کے خیال میں حکومت کا قیام اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ اصل مقصد بلاشبہ عوام کا مفاد اور ان کی بہبود اور انہیں بہترین اخلاقی زندگی فراہم کرنا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسانی قدریں اور اخلاق کا تعلق ضمیر سے ہے اور انسانی ضمیر کو جبر و استبداد اور سزا کے ذریعے کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے نزدیک انصاف ایک اندرونی قوت ہے جو انسان کے فطری رجحانات سے منسوب ہے۔ یہ کہنا کہ حکمران یا حکومت کے قوانین عوام کے مفاد میں ہوتے ہیں اس لیے غلط ہے کہ جس حکمران کے پاس علم نہیں ہو گا وہ معاشرے کے خلاف کوئی بھی حکم دے سکتا ہے اگر شہری اس حکم پر عمل کریں گے تو عوام اور حکومت دونوں کے خلاف کام کریں گے۔ لہٰذا حکمران کے پاس علم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ افلاطون اپنے سگے بھائی گلاکون (Glaucon) کے ان تصور انصاف کو کہ "انصاف کمزوروں کا مفاد ہے" کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے

خیال میں مملکت اور قوانین فطری ہوتے ہیں اور اس تصور انصاف کے اطلاق سے قوانین خارجی ہو جائیں گے۔

افلاطون کا تصور انصاف اس کی مثالی مملکت کی تشکیل کا بنیادی اصول تخصیص کار میں پنہاں ہے اور اس کے مطابق انصاف اور عدل یہی ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق فرائض تفویض کیے جائیں اور وہ طبقہ یا افراد ان تفویض کردہ فرائض کو اپنے اپنے متعین کردہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے سر انجام دیں۔ دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہ کرے اور نہ ہی اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرے۔ اگر ایک فلسفی حکمران اپنے تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی دانشمندی سے کرتے ہوئے دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہیں کرتا تو وہ انصاف کر رہا ہے۔ اس طرح ایک سپاہی اپنی ہمت اور بہادری سے مملکت کا دفاع کرتا ہے اور معاشی طبقہ صرف معاشی فرائض سر انجام دیتا ہے اور دوسروں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا تو بنیادی طور پر یہ دونوں طبقے بھی انصاف کرتے ہیں۔

در اصل بنیادی طور پر افلاطون کا تصور انصاف عدل خود اختیاری (Autonomy) کا اصول ہے جس کے تحت اس کی مثالی مملکت کا ہر طبقہ دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہے۔ ان کے نزدیک انسانی ذہن کا سہ درجاتی تصور ہی انصاف کا تصور ہے۔ تمام تر اچھائیوں کا انحصار انصاف ہے اور انصاف کے ذریعے معاشرے میں باہمی تعاون و ربط کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے خیال میں ذہنی استعداد کے اعتبار سے تمام انسان برابر نہیں ہوتے ہیں اس لیے انہیں یکساں فرائض نہیں سونپے جا سکتے۔ اس لیے انہیں ذہنی استعداد اور اس کے خارجی اظہار کے تحت فرائض سونپے جانے چاہئیں تاکہ فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی سرزد نہ ہو۔ اشتہا سے محبت رکھنے والے لوگوں کو معاشی ذہنی اعتبار سے حوصلہ و جذبہ کے حامل لوگوں کو ملکی دفاع اور عقل و دانش رکھنے والے لوگوں کو عنان حکمرانی کے فرائض سونپے جانے چاہیں اور ان تینوں طبقوں کو اس بات

کا پابند ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے تفویض کردہ فرائض متعینہ دائرہ کار کے اندر اور ایک دوسرے کے فرائض میں مداخلت کیے بغیر سرانجام دیں۔

افلاطون کے نزدیک مثالی مملکت کے قیام اور استحکام کے لیے اشتمالیت کا عملی نفاذ ضروری ہے اس کے خیال میں نجی ملکیت اور خاندان معاشرتی انحطاط پذیری اور زوال پذیری کے باعث ہیں اور ان دونوں ادارت کو ختم یا محدود کر کے معاشرے کی عمومی اصلاح ممکن ہے۔ نجی ملکیت کو حکمران اور فوجی طبقے کے لیے ممنوع قرار دینا اس کے تصور اشتمالیت کا ایک رخ ہے۔ وہ حکمران اور فوجی دونوں طبقات کے لیے کسی بھی قسم کی نجی ملکیت کو نقدی یا جائیداد دونوں صورتوں میں جائز خیال نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ان دونوں طبقوں کے لیے مکان، لباس، خوراک، روپیہ پیسہ سب کچھ معاشی طبقہ فراہم کرے گا۔ اس کی مثالی مملکت میں معاشی طبقے کو نجی ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے خیال میں مثالی اشیاء کے حصول کے لیے جدوجہد انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ روپیہ پیسہ اور جائیداد کی لالچ انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس لیے حکمران اور فوجی طبقہ انسانی فطرت کے اس خاصے کے تحت روپیہ پیسہ اور جائیداد بنانے کی لالچ میں مملکتی امور پر توجہ نہ دے سکے گا جس سے مملکت کے مقاصد اور متعین فرائض کی بجا آوری ممکن نہیں رہے گی۔ مزید اگر تینوں طبقوں کو نجی ملکیت رکھنے کی اجازت دی گئی تو وہ متعینہ فرائض سے غفلت برت سکتے ہیں حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تینوں طبقات اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر فرائض سرانجام دیں۔

اسی طرح افلاطون کے خیال میں معاشی طبقے کا خاندان ہونا چاہیے تاکہ اس طبقہ کے مختلف خاندانوں کے افراد مل کر دو اعلیٰ طبقات حکمران اور فوجیوں کی معاشی اور نفسانی خواہشات پوری کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ اشتہا کا نمائندہ معاشی طبقہ خاندان رکھ سکتا ہے تاکہ اس طبقہ کی عورتیں حکمران اور فوجی طبقے کی دیگر مادی ضروریات کی طرح جنسی خواہشات بھی پوری کر سکیں۔

افلاطون کا یہ نظریہ "اشتراک ازواج" مملکت کے اس مقصد کے حصول کے لیے تھا کہ مملکت کو ایک خاندان کی طرح ہونا چاہیے اور مملکت کے تمام افراد ایک خاندان کے افراد کی طرح مملکت کی سالمیت اور بقا کے لیے اخلاقی اقدار اور اصول و ضوابط کو پس پشت ڈال کر سرگرم عمل ہو جائیں۔ اس کے خیال میں خاندان کا وجود فرد کی ذاتی خواہشات کا نتیجہ ہوتا ہے اور ذاتی خواہشات کی طرح حکمران اور فوجی طبقوں میں خاندان رکھنے کی خواہش ختم ہونی چاہیے۔

پروفیسر بارکر اپنی کتاب Political Thought of plato and Aristotle میں افلاطون کے اس تصور اشتمالیت کی نفسیاتی' اخلاقی' سیاسی اور عملی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ افلاطون کا یہ تصور دراصل ان نفسیاتی بنیادوں کا نتیجہ ہے جن پر اس نے اپنی مثالی مملکت کے تصور کی بنیاد رکھی جن میں مملکت کے انسانی ذہن کی پیداوار اور انسانی ذہنی کی استعداد Q -اکے اعتبار سے یکساں نہ ہونا ہے۔ پروفیسر بارکر کے خیال میں افلاطون کا انسانی ذہن کے مطابق مملکت کے تینوں طبقات کے لیے فرائض کا تعین کرنا' ہر طبقہ کو اپنے دائرہ کار میں متعنہ فرائض کی بجا آوری اور حکمران اور فوجی طبقہ کی نجی جائیداد رکھنے کی ممانعت ہے اور یہی بنیادی نقطہ افلاطون کے تصور اشتمالیت کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ پروفیسر بارکر اس فلسفہ کی اخلاقی بنیادوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ افلاطون کے اس تصور کا ماخذ اس کا تصور انصاف ہے جس میں وہ واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ افراد اور طبقوں میں ان کی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فرائض تفویض کرنا اور تفویض کردہ فرائض کو اپنے اپنے دائرہ ہائے کار کے اندر رہتے ہوئے دوسروں کے فرائض میں مداخلت کیے بغیر سر انجام دینا ہی عین انصاف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ حکمران اور فوجی طبقے معاشی فرائض کے دائرہ کار سے دور رہیں اور معاشی طبقہ اس طبقات کے فرائض میں مداخلت نہ کرے۔

سیاسی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے بارکر لکھتا ہے کہ حکمران اور فوجی طبقے کے لیے

نجی ملکیت اور خاندان ممنوع قرار دینے کا بنیادی مقصد مثالی مملکت کو مستحکم کرنا تھا اس لیے بجا طور پر یہ کہنا درست ہے کہ اس کا یہ قدم سو فیصد سیاسی تھا اور یہی اس کے تصور اشتمالیت کی بنیاد ہے۔ گارنر اور سیبائن نے بھی بارکر کے اس قول کی تائید کی ہے۔

گارنر کہتا ہے کہ سیاسیات کی ابتدا مملکت سے ہوئی ہے اور اس کی انتہا بھی مملکت ہے۔ سیبائن کے مطابق افلاطون کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بھی ملکیت کے خاتمے کا تصور پیش کر کے حکمران اور فوجی طبقے کو دولت سے دور رکھے۔ بارکر اس تصور اشتمالیت کی عملی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سب سے پہلی عملی بنیاد یہ ہے کہ افلاطون تعلیم کو مملکت کے کنٹرول میں دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تعلیم کو نجی شعبے کے حوالے کیا گیا تو افراد کی تربیت مملکتی مقاصد اور نصب العین کے مطابق نہیں ہوگی بلکہ وہاں محض نفع کمانے کا رجحان ہو گا۔ جس کی وجہ سے مملکتی مقاصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دوسری عملی بنیاد یہ ہے کہ اگر نجی ملکیت اور خاندان کے ادارے کو برقرار رکھا گیا تو حکمران اور فوجی طبقے کی مکمل توجہ مملکتی امور پر مرکوز نہ رہ سکے گی۔ اس کے خیال میں مملکتی امور کی انجام دہی میں مرد اور عورتیں مساوی طور پر کار آمد ہیں اگر خاندان کے ادارے کو برقرار رکھا گیا تو عورتوں کی توجہ زیادہ تر بچوں کی نگہداشت پر مرکوز رہے گی جس کی وجہ سے مملکتی امور کی انجام دہی ممکن نہیں رہے گی۔ اس کے مطابق عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ مملکتی مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔

نظریہ کلیات

کلیات کے نہائت پیچیدہ مسئلہ کو جسے بہت سے فلسفی مابعد الطبیعیات کا مرکزی مسئلہ سمجھتے ہیں کے فلسفہ کو سب سے پہلے افلاطون نے متعارف کرواتے ہوئے کہا کہ کلیات ایک مخصوص معنی میں واقعتاً موجود ہیں' حقیقت منفردات اور کلیات دونوں پر مشتمل ہے' اخلاقی خصوصیات اور ریاضیاتی حقائق کلیات کا حصہ ہیں' کامل نیکی یا عدل پوری دنیا میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں کامل خط مستقیم یا کامل دائرہ ہوتا ہے اور کلیات کی غیر کامل مثالیں منفردات ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک کلیات اور منفردات کی ماہیت ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ ان کے درمیان کسی نسبت کا ہونا مشکل ہے۔ منفردات زمان و مکان میں موجود ہوتے ہیں مگر کلیات نہیں۔ کامل دائرہ کی کوئی منفرد مثال نہ ہونے کے باوجود کامل دائریت کا وجود ہوتا ہے اس کے خیال کے مطابق دنیا میں نیلی چیزوں کا وجود ہوتا ہے نیلے پن کا نہیں۔

افلاطون کے اولین مکالموں میں یہ نظریہ موجود کہ دنیا میں جو گھوڑے ہیں وہ تمام تر غیر کامل ہیں اور حقیقت میں کہیں کامل گھوڑے کا وجود ہے جس کی حقیقی گھوڑے نقل ہیں اور یہی بات تمام چیزوں کے بارے میں صادق آتی ہے۔ اس نے لفظ شرکت کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ منفردات کلیات میں شریک ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک کلیات کا وجود اتنا ہی معروضی ہے جتنا ان چیزوں کا جو ان کی مثال بنتی ہیں۔ کلیات وہ ہوتے ہیں جن کا وجود منفردات کے وجود سے مختلف ہوتا ہے اگر ان کی منفرد مثالیں نہ بھی ہوں تب بھی ان کا وجود ممکن ہو گا۔ تصور ہمارے ذہن میں ہے مگر یہ تصور جس چیز کا ہے وہ ہمارے ذہن میں نہیں بلکہ خارجی طور پر حقیقت کا حصہ ہے اور حقیقت میں دو طرح کی چیزیں ہیں منفردات جو کلیات کی مثالیں ہیں اور کلیات جن کی مثالیں ہوتی ہیں گو کلیات کا مشاہدہ منفردات کی طرح ممکن نہیں۔

ارسطو نے افلاطون کے اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ منفردات سے الگ کلیات کی دوسری دنیا نہیں۔ اگر دوسرے عالم کا وجود تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ عالم کلیات نہیں ہو گا بلکہ منفردات کا دوسرا عالم ہو گا جو کامل تر منفردات پر مشتمل ہو گا۔

افلاطون کا تصور تعلیم

افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف الجمہوریہ میں اگرچہ تعلیم سے متعلق کوئی باضابطہ نظریہ پیش نہیں کیا لیکن اس کتاب میں دیئے گئے تعلیمی تصورات سے ایک باضابطہ نظریہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک نظام تعلیم بذات خود اصل مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد کے حصول کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس کے خیال میں مثالی مملکت انسانی ذہن کی مظہر ہے اس لیے انسانی ذہن کو مثالی مملکت کے اعلیٰ معیار تک لانے کے لیے افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جانا ضروری ہے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ناقص معاشرے کو نئے سرے سے نئی بنیاد پر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ جب انسانی اصلاح کے دوسرے تمام ذرائع ناکام ہو جاتے ہیں تو مناسب وقت پر دی جانے والی تعلیم ہی امید کی آخری کرن ہوتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک انصاف یا عدل انسانی ذہن کی ایک صفت ہے اور انصاف کے نفاذ کے لیے انسانی ذہن کی تربیت ضروری ہے جس کا بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم کا مقصد خود آگاہی ہے اس لیے دوران تعلیم روح کی شکل پذیرائی کا اہتمام ضروری ہے۔ اصل تعلیم پچاس سال کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ اس عمر میں انسان کی عمر پختگی کے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ تعلیم فرد کی روح اور ذہن کو جلا بخشتی ہے جس سے وہ خیر اور شر، نیکی اور بدی، اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے اور وہ اخلاقی اعتبار سے خود کفیل ہو جاتا ہے۔

افلاطون کا تعلیمی فلسفہ دراصل ایتھنز کے نظام تعلیم کی اصلاح و ترمیم شدہ صورت تھی خصوصاً اس کا ابتدائی تعلیم کا سارا نظام ایتھنز اور سپارٹا کے طریقہ ہائے تعلیم کی اصلاح یافتہ صورت تھی۔ اس وقت ایتھنز اور سپارٹا کے طریقہ تعلیم مختلف تھے اور ان مختلف حالات و ماحول کے پابند تھے جس کے زیر اثر یہ دونوں ریاستیں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ایتھنز میں تعلیم ذاتی مسئلہ تھی اور ریاست سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ مکاتیب کا ہونا ذاتی معاملہ تھا اور لوگ تعلیم اپنی اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرتے تھے۔ لڑکیوں کو صرف گھریلو قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم 6 سال سے 14 سال تک اور ثانوی تعلیم 14 سال سے 18 سال تک دی جاتی تھی۔ بعد ازاں دو سال کے لیے فوجی تربیت دی جاتی تھی اور اسی حصہ سے ریاست کا تعلق ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے نصاب میں جمناسٹک اور فن موسیقی شامل تھا۔ ثانوی تعلیم کے لیے طلباء کو فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ یہ تعلیم بڑی مہنگی تھی اور صرف امراء حاصل کرتے تھے۔ ایتھنز کا تعلیمی نظام صرف خاندان تک محدود تھا اور اس کا دراصل مقصد جسمانی نشوونما، وافر ذہنی قوت اور بے عیب ذوق کا حصول تھا۔

دوسری جانب سپارٹا کا نظام تعلیم مکمل طور پر ریاست کے کنٹرول میں تھا۔ اس نظام کے تحت لڑکے کو سات سال کی عمر میں والدین سے لے کر ریاست کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ والدین کو تعلیم دلوانے سے کوئی غرض نہ تھی یہ سب کچھ ریاست کرتی تھی۔ طالب علم مکانوں یا بورڈنگ ہاؤسز میں رہتے تھے اور ان کی قدیم پبلک سکولوں کی طرز پر تربیت کی جاتی تھی انہیں جنگ کے طریقوں سے روشناس کروایا جاتا تھا۔ انہیں بار بار آزمائشی تجربوں اور امتحانات سے گزارا جاتا تھا۔ اس طرح جنگجو تیار کیے جاتے تھے۔ سپارٹا میں عام تعلیم کے نصاب میں جمناسٹک، فن موسیقی اور رزمی رقص شامل تھے۔ امیر، غریب میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ جرات و حوصلہ، نظم و ضبط اور قوت برداشت کے عنصر کی افزائش کی جاتی تھی لیکن اس نظام میں دانائی کے عنصر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی

جاتی تھی۔ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر تعلیم دی جاتی تھی اور وہاں تعلیم کا مقصد نوجوانوں کو فوجی تربیت سے آراستہ کرنا تھا۔ افلاطون سپارٹا کے نظام تعلیم سے متاثر تھا۔

افلاطون کے نزدیک تعلیمی نظام کا ریاستی کنٹرول میں ہونا ضروری ہے جس کا بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ مملکت اپنی ضرورت کے مطابق تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد پیدا کرے گی۔ اس کے خیال میں تعلیم حاصل کرنا یا نہ کرنا افراد کی اپنی مرضی پر منحصر نہیں ہونا چاہیے بلکہ افراد کو لازمی طور پر By force تعلیم دی جانی چاہیے۔ وہ مثالی مملکت کو تین طبقات غلام، فوجی اور فلسفی حکمران میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تینوں طبقات کے لیے الگ الگ اور ان کی ذہنی سطح جس کی بدولت وہ معاشرہ میں اپنے مقام کا تعین کرتے ہیں کو ملحوظ خاطر رکھ کر نصاب کا تعین کرنا چاہیے۔ کیونکہ مثالی مملکت کے حکمران تعلیم کے ذریعے ہی انصاف کی روح کو سمجھ سکتے ہیں اور جب یہ طبقات انصاف کی روح کو سمجھیں گے تب ہی مثالی مملکت کا قیام عملاً ممکن ہوگا۔ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں تعلیم ہونی چاہیے کیونکہ جس طرح ایک کتا نگرانی کے فرائض انجام دیتا ہے بالکل اسی طرح ایک کتیا بھی نگرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک مرد نگرانی کے فرائض انجام دے سکتا ہے تو ایک عورت بھی نگرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ مملکت کی پچاس فیصد آبادی عورتوں پر مشتمل ہوتی ہے اگر انہیں صرف امور خانہ داری پر لگا دیا جائے یا صرف بچے پیدا کرنے کے لیے مخصوص کر دیا جائے یا اگر مرد انہیں اپنے لیے جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھیں تو مملکتی امور یقیناً متاثر ہوں گے۔

افلاطون نے اپنے نظام تعلیم کو چار مختلف مدارج ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ترین تعلیم میں تقسیم کرتے ہوئے ان کے لیے مثالی مملکت کے مقاصد کے لحاظ سے الگ الگ نصاب کا تعین کیا۔ اس کے خیال میں ابتدائی تعلیم پیدائش سے لے کر سات سال کی عمر تک گھر پر ہی دی جانی چاہیے اور بچے کی ذہنی نشوونما کے لیے انہیں اس عرصہ کے دوران اعلیٰ اخلاقیات کی حامل کہانیاں سنانے کے ساتھ ساتھ دیوتاؤں کے بارہ

میں بتایا جائے تاکہ بچپن سے ہی بچوں کا ذہن اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مذہب سے واقف ہو سکے اور بڑے ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور اعلیٰ اخلاقی کردار کا مظاہرہ کر سکیں۔

اس کے نزدیک بچوں کی دینیات میں یہ تعلیم نہیں ہونی چاہیے کہ جو کچھ کرتا ہے وہ خدا ہی کرتا ہے ان کو یہ بتانا چاہیے کہ خدا فقط اچھی باتیں کرتا ہے شر کو بھی خدا کی طرف منسوب کرنا بڑا ظلم ہے۔ ان کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ خدا جسے جیسا چاہتا ہے بنا دیتا ہے کسی کو جہنم کے لیے بناتا ہے اور کسی کو جنت کے لیے۔ جب وہ کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے پہلا اصول یہ ہے کہ خدا کو خیر مطلق کے طور پر پیش کیا جائے۔ دوسرا اصول خدا کے بارے میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی فطرت نہیں بدلتا۔ خدا میں سب صفات حسنہ کا کمال ہے۔ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں خدا صداقت مطلقہ ہے اور صداقت مطلقہ میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔

ثانوی تعلیم سات سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک دی جانی چاہیے۔ چونکہ ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ پرورش پاتا ہے اس لیے اس عرصہ کے دوران جسمانی تربیت کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ وہ اس ثانوی سطح کے لیے اپنے نصاب میں جمناسٹک اور موسیقی کو شامل کرتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ جمناسٹک ایک صحت مند جسم کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اس لیے اس مرحلے میں اس کی اہمیت مسلمہ ہے اور پھر ایک صحت مند آدمی کو حکیم یا دواؤں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ایک صحت مند جسم میں ہی ایک صحت مند ذہن پرورش پا سکتا ہے۔ جمناسٹک میں خوراک، دوا اور جسمانی ورزش تینوں شامل ہیں۔ اس عرصہ تعلیم میں طبعی سائنس کے مطالعہ سے تدبر اور اچھائی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک موسیقی میں ادب اور فن بھی شامل ہے جو مملکت کے اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مقصد ذہن کی براہ راست تربیت کرنا، جذبات کی اصلاح کر کے متوازن بنانا اور قوت استدلال کو صورت اظہار

بخشتا ہے۔ موسیقی فرد کی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرواتی ہے جس کی بدولت وہ پیش آنے والے مسائل کو اپنی طرز پر حل کر سکتا ہے لہٰذا موسیقی کے اخلاقی پیغام کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اسے حکومت کے زیرانتظام رکھا جائے۔ موسیقی کو خاص احتیاط سے موزوں کرنا چاہئے کیونکہ موسیقی کی تربیت دوسرے ہر تربیتی ذریعے سے زیادہ طاقتور ہے۔

افلاطون کے نزدیک جمناسٹک اور موسیقی دونوں کا مقصد فرد کے کردار کی تشکیل کرنا ہے۔ جمناسٹک خود ضابطگی اور دوسری انسانی اقدار کا سبق سکھاتی ہے جبکہ موسیقی میں شاعری کا مطالعہ اور دیگر اصناف ,گانا اور موسیقی بجانا شامل ہے۔ لہٰذا کردار کے خلاف جانے والے ادب اور موسیقی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں پر حکومت کی سخت نگرانی ہو۔

افلاطون کے نظام تعلیم میں ثانوی تعلیم کا سلسلہ اٹھارہ سال کی عمر تک رہتا ہے۔ جانچ کے بعد جو طلباء فیل ہونگے انہیں نچلی سطح کے فرائض سونپے جائینگے جبکہ کامیاب طلباء کو مزید دو سال کی تربیت دی جائیگی اور اس دو سالہ تعلیم میں زیادہ تر ریاضی اور عملی تربیت پر زور دیا جائیگا۔ افلاطون کے خیال میں ریاضی کے علم کا نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے جاننا ضروری ہے۔ یہ علم نظری طور پر انسان کی سچائی تک راہنمائی کرتا ہے اور عملی طور پر میدان جنگ میں فوجیوں کو منظم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

افلاطون کے زمانہ میں ایتھنز میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب سوفسطائی معلم جاری رکھے ہوئے تھے جس میں اٹھارہ برس کے بعد نوجوانوں کو خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا۔ افلاطون نے اس نظام کو یکسر تبدیل کر دیا۔ بیس سال کی عمر میں پھر امتحان ہوگا اس امتحان میں جسمانی طور پر مضبوط و توانا طالبعلم جن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوگی کو فوجی فرائض سونپے جائینگے اور جن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی انہیں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے منتخب کیا جائے گا۔

سیبائن کہتا ہے کہ افلاطون کا اعلیٰ تعلیم کا نظام منفرد اور مخصوص ہے اس نظام کے تحت مختلف طلباء کو 20 سے 35 سال کی عمر تک محافظ طبقہ کی کلیدی آسامیوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا نظریہ افلاطون کا ذاتی اور بالکل اچھوتا نظریہ ہے۔ اس مرحلے کے نصاب میں علم ریاضی، علم طب، علم نجوم، مابعد الطبیعات اور فلسفہ کی تعلیم ضروری ہوگی۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے علوم فرد کے لیے سکون قلب کا باعث ہوتے ہیں اور بالخصوص مابعد الطبیعات کی تعلیم سے فرد کے اندر مراقبہ کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تعلیم 35 سال تک دی جائیگی جس میں 30 سال تک ریاضی اور علم نجوم پر زور دیا جائے گا۔

30 سال سے 35 سال تک طب، مابعد الطبیعات، اخلاقیات اور فلسفہ کی تعلیم دی جائیگی۔ 35 سال کی عمر میں پھر امتحان ہوگا جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوں گے ان کو مزید تعلیم کے لیے منتخب کیا جائیگا اور جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہوں گے انہیں وکیل، مجسٹریٹ اور حکومت کے دیگر انتظامی عہدوں پر فائز کیا جاسکتا ہے۔

کامیاب ہونے والے لوگ اعلیٰ تعلیم کے اہل ہونگے اور یہ لوگ فلسفی کہلائیں گے جن کو پچاس سال کی عمر تک مزید 15 سال تعلیم دی جائیگی۔ اس مرحلے میں خالص فلسفہ اور منطق پڑھایا جائیگا یہ لوگ فلسفی کہلائیں گے اور پچاس سال کی عمر کے بعد انہیں عنان حکومت دی جائیگی اور یہ مثالی مملکت کا اعلیٰ ترین طبقہ کہلائیں گے۔ افلاطون کے خیال میں صرف فلسفی ہی حقیقت اور سچائی کو پہچان سکتے ہیں اس لیے وہی لوگ حکومت کی اہم ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں اور انصاف جو مثالی مملکت کا نصب العین ہے کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

افلاطون کے متذکرہ نظام تعلیم میں پہلے دو مرحلوں میں اسپارٹا اور ایتھنز کے مروجہ تعلیمی نظام کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن اعلیٰ اور اعلیٰ تر تعلیم میں ریاضی، فلسفہ اور مابعد الطبیعات کی تعلیم پر زور دینا جدت پسندی اور نیاپن تھا اور اسی باعث اس نے عملی طور پر اپنی اکادمی قائم کر کے ان مضامین کی تعلیم کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا۔

مختلف مفکرین نے افلاطون کے اس نظام تعلیم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نظام غیر جمہوری اور طبقاتی نظام تعلیم ہے اور اس نظام تعلیم سے لوگوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نے مخصوص طبقات کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے معاشی طبقہ کو کافی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ مزید اس کا یہ نظام تعلیم خیالی دنیا میں مگن رہنے کا جذبہ تو پیدا کر سکتا ہے مگر عملاً ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر اس نظام تعلیم پر غور کیا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ افلاطون کے تصورات میں "انصاف" ایک مرکزی تصور ہے جو اس کے تمام تصورات کا محور ہے۔ اس کے نظریہ انصاف میں مثالی مملکت کا ہر طبقہ اپنے اپنے مقرر کردہ فرائض انجام دیتا ہے اور دوسروں کے وظائف میں مداخلت نہیں کرتا اور افلاطون اس نظام تعلیم کے ذریعے اس اصل یعنی انصاف کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔

افلاطون کا نظریہ انصاف

الجمہوریہ میں افلاطون نے لفظ انصاف کو یونانی لفظ Dikaisune کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو لفظ Justice سے کہیں وسیع ہے۔

افلاطون کے نزدیک انصاف اس جذبہ کا نام ہے جس کے باعث ہر شخص صرف اپنے ہی فرائض کے دائرہ عمل میں رہتا ہے اور دوسروں کے فرائض کے دائرہ عمل میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں ہر شخص کو صرف ایک کام کرنا چاہئے اور یہ کام اس کے فطری میلان کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ دوسروں کے کام میں مداخلت کرنا نہ صرف انصاف کے منافی ہے بلکہ نقصان کا باعث بھی ہوتا ہے۔ مثالی ریاست کی تنظیم میں فرائض کی تخصیص ہونی چاہئے اور ہر شخص کو اپنے کام کے علاوہ دوسرے کے کام سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔

اس کے نزدیک جو ریاست مناسب کے ہم آہنگ توازن سے جنم لیتی ہے اس میں انصاف منظم اتحاد کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ توازن معاشرے کو تین نفسیاتی بنیادوں پر تقسیم کر کے حاصل ہوتا ہے اور وہ تین بنیادیں معاشرے کے تینوں طبقے مزدور، سپاہی اور حکمران ہیں۔ اس کے خیال میں کسی بھی شہری کو فرد واحد سمجھنے کی بجائے خود کو معاشرہ یا ریاست کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ انصاف کا مطلب خدمت خلق ہے اور خدمت خلق اس سماجی اجتماع افراد کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی خدمت سر انجام دی جاتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک شہری ریاست کے سیاسی اور سماجی برائیوں کا واحد علاج انصاف ہے اور

انصاف ہے اور انصاف کی خوبی ریاست میں حیثیت مجموعی اور فرد میں حیثیت انفرادی موجود ہے۔ ایک مثالی ریاست میں انصاف موجود ہوتا ہے اور یہ خوبی دوسری دانائی، جرأت، ضبط نفس جیسی خوبیوں کے وجود کا باعث ہے۔ تقسیم کار سے مراد قوم کی اخلاقی بہبود اور فرائض کی تخصیص کا مطلب ہر آدمی کا اپنا وہ فرض سرانجام دینا ہے جس کے لیے وہ موزوں ترین ہے اور جس کام کو اس کی فطرت سب سے زیادہ قبول کرتی ہے۔

افلاطون اپنے نظریہ انصاف میں Glancon,Cephalus, اور Thrasymachus کے نظریات انصاف پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ Cephalus کا یہ کہنا کہ "انصاف ایک فن ہے" غلط ہے۔ انصاف فن کا ہم معنی اور ہم پلہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے تجربی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ انصاف ایک انسانی خوبی ہے یہ انسان کے دل و دماغ کی آواز ہے اور یہ اس طرز کی خوبی ہے کہ اگر کوئی خوبی انصاف کو اپنا لے تو پھر وہ کسی کے جذبات کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ وہ سماج کے ہر فرد کا فائدہ سوچتا ہے۔ افلاطون Thrasymachus کے انصاف کے اس اصول کو کہ "انصاف سب سے مضبوط آدمی کا مفاد ہے اور ہر طرز حکومت میں ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جو حکمران یا حکمرانوں کے حقوق کی مدافعت کرتے ہیں اس لیے فرد کو چاہیئے کہ جو کچھ وہ کر سکتا ہے کرے اور جو کچھ وہ حاصل کر سکتا ہے وہ اسی کا حق ہے۔ وہ جو کام کرے حکمرانوں کی خوشنودی اور مفاد کے لیے کرے کیونکہ ناانصافی کو انصاف پر اولیت حاصل ہے۔" پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی چیز کے منصب کے مطابق اس سے موزوں کام لینے ہی میں اس چیز کی خوبی مضمر ہے۔ روح کی پاکیزگی کے لیے بہتر زندگی ضروری ہے اور بہتر زندگی ہی انصاف ہے۔ اگر بہتر زندگی ہوگی تو خوشی ہوگی اور چونکہ خوشی غم سے بہتر ہے اس لیے انصاف خوشی کی ضمانت ہے۔ اور خوشی سے خوشحال زندگی ممکن ہے اور انصاف ناانصافی سے بہتر ہے۔ آنکھ کی خوبی اسی میں مضمر ہے کہ آنکھ صاف دیکھے اور کان کی خوبی یہ ہے کہ وہ صاف صاف اور واضح سن سکے۔ اسی طرح روح کی

خوبی روح کی پاکیزگی میں مضمر ہے۔ روح کی پاکیزگی کا دوسرا نام "اچھی زندگی" ہے۔ مقتضائے روح کے منافی کام کر کے روح کی پاکیزگی کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ روح کی پاکیزگی کے لیے بہتر زندگی ضروری ہے چونکہ فطری طور پر خوشی غم سے زیادہ بہتر ہے اس لیے یہ خیال کرنا کہ ناانصافی کو انصاف پر اولیت حاصل ہے غلط ہے۔

افلاطون "Glancon" کے اس نظریہ انصاف پر کہ "انصاف ایک مصنوعی اور رسمی شے ہے یہ خوف کی پیداوار کمزوروں کی ضرورت ہے اور یہ کمزوروں کی سوچ اور آپس کا معاہدہ تھا کہ وہ آپس میں ناانصافی نہیں کریں گے اور پھر انہوں نے اس معاہدہ کے تحت ایسے قانون بنائے جو آج تک انسان کا معیار عمل اور اصول انصاف ہیں اور انہیں قوانین کے تحت انہوں نے اپنی جبلی خواہشات پر قابو پایا"۔ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انصاف عین تقاضائے فطرت ہے 'انسانی روح کی صحیح تر صورت ہے اور انسان داخلی شے ہے۔

سبائن افلاطونی انصاف کے بارہ میں کہتا ہے کہ انصاف ایسا خون ہے جو معاشرے کو یکجا رکھتا ہے۔ معاشرہ افراد کا یکجان اتحاد ہوتا ہے جبکہ ہر فرد اپنا مقصد حیات اپنی فطری اہلیت تربیت کے مطابق منتخب کر لیتا ہے۔ یہ عوامی اور ذاتی دونوں طرح کی خوبی ہے کیونکہ ریاست اور اس کے افراد کی اعلیٰ ترین خوبی کا انحصار اسی میں مضمر ہے کسی فرد کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی بہتر بات نہیں کہ اسے جو کام ملے وہ اس کے کرنے کا انتہائی اہل ہو اور اسی طرح کسی دوسرے فرد یا سارے معاشرے کے لیے اس سے زیادہ بہتر کوئی صورت نہیں کہ ہر کوئی اپنے اپنے موزوں مقام پر نہایت مناسبت سے کام کرتا رہے۔ ریاست کا تجزیہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تین چیزیں ریاست کے فرائض میں شامل ہیں۔ انسانی ضروریات کی تکمیل بہر حال ہونی چاہیے اور ریاست کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر حکومت بھی کرنی چاہیے۔ "فرائض کی تخصیص" کی رو سے ضروری ہے کہ لازمی خدمات کی نشان دہی کر دی جائے اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ

خدمات کے لحاظ سے ریاست میں تین طبقات ملتے ہیں۔ کارکن لوگ، سپاہی اور حکمران طبقہ یا فلسفی حاکم (اگر وہ اکیلا ہو) چونکہ کام کی تقسیم کا انحصار ذاتی رجحان اور مناسب طبع پر ہے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست میں تین قسم کے اشخاص ہوتے ہیں۔ وہ جو فطرتاً کام کرنا جانتے ہیں اور حکومت نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ جو دوسروں کے اشاروں اور احکام کے سبب حکومت کر سکتے ہیں اور خود اس کی اہلیت نہیں رکھتے اور تیسرے وہ لوگ جو دراصل حکمران ذہن کے مالک ہوتے ہیں اور اصل سیاستدان کہلانے کے حقدار ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان تینوں کرداروں میں اپنی اپنی خوبی ہو۔ دانائی حکمران کا اور جذبہ سپاہی طبقہ کا حصہ ہے۔ اچھائی کا پتہ مجرد علم سے حاصل کرنا چاہیے اور اس طرح یہ نظریہ اسی تصور کے بل بوتے پر ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے کہ یہ اصولِ اچھائی معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور یہ معاشرہ میں پوشیدہ ہے تقسیم کار اور فرائض کی تخصیص معاشرتی تعاون کی شرط ہے اور فلسفی بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ معاملات نہایت منافع بخش اور مفید عمل طریقہ پر حل کریں۔

افلاطون کے نزدیک اصل مقصد یہ ہے کہ ریاست کے فراہم کردہ مخصوص ذرائع کار کے امکانی حصول میں انسان کو پوری طرح حصہ ملے باقی صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ حکمران انسان کو مناسب حصہ دینے کے لیے کن ذرائع سے کام لے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے صرف دو طریقے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یا تو اچھی طرح شہریت کے متناقض حالات کو ختم کر دیا جائے یا اچھی شہریت کے تقاضے پورے کرنے والے حالات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اول الذکر صورت میں نظریہ اشتراکیت (کمیونزم) سامنے آتا ہے موخرالذکر صورت میں نظریہ تعلیم سے سابقہ پڑتا ہے۔

بارکر کے خیال کے مطابق "تقسیم کار" اور "فرائض کی تخصیص" ایسے سراغ ہیں جن کی وجہ سے ہمیں انصاف کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ افلاطون ریاست کی ترکیب میں جن خوبیوں کی نشاندہی کرتا ہے وہ انصاف، دانائی، جرات اور ضبط نفس ہیں۔ پھر وہ باری باری

آخری تین اقدار کو ریاست میں اپنے اپنے مخصوص مقامات دیتا ہے اور آخر میں انصاف کی قدر کو ایک مقام پر مخصوص کرتا ہے۔ در حقیقت ریاست کی یہ خوبیاں افراد ہی کی خوبیاں ہیں بشرطیکہ یہ افراد ریاست کے باشندے ہوں۔ دانائی حکمران طبقہ کی صفت ہے جو اپنی حکومت کو دلائل و بصیرت سے چلاتا ہے۔ جرات سپاہی کی خوبی ہے اور ضبط نفس کا شتکار طبقہ کا وصف ہے۔ لیکن اعتدال پسندی کا وصف ہر طبقہ میں دوسری خوبیوں سے کچھ زیادہ ہے۔ ریاست کی نرم خوئی کا بحیثیت مجموعی مطلب یہ ہوگا کہ ایک طرف تو کاشتکار اور سپاہی دونوں طبقے حکومت کے آگے اطاعت گزاری کی ضرورت کا احساس پیدا کریں اور دوسری طرف حکومت بھی ان طبقات کی ضروریات کی تکمیل کا خیال رکھے جن کی بدولت یہ حکمرانی قائم ہوئی۔ چنانچہ ضبط نفس ہی ریاست کے مختلف عناصر ترکیبی کو متحد رکھنے کا ذریعہ ہے۔

انصاف فرائض کی تخصیص ہے۔ انصاف اس عہد کا نام ہے کہ ہر آدمی اپنا کام کرے گا اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے گا۔ یہ سنہری اصول ریاست کی بنیاد کی تعمیر کے وقت وضع کیا گیا تھا کہ ہر آدمی کو صرف وہ ایک کام کرنا چاہیے جو اس کی فطری طبع کے لحاظ سے سب سے زیادہ مناسب ہو۔ اس طرح انصاف ہر دوسری خوبی کے لیے ضروری ہے کیونکہ جب تک کوئی شہری منصفانہ طور پر اپنے دائرہ عمل میں پوری تندہی اور توجہ سے کام نہیں کرے گا اس کی اس خوبی کا پتہ نہ چل سکے گا جو اس کے دائرہ عمل میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اسطرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرتی انصاف معاشرے کے ایک اصول کا نام ہے۔ جبکہ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگ مثلاً حکمران، سپاہی، مزدور ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضرورت کی تکمیل کی خواہش کے تحت مل جل کر رہتے ہیں وہ ایک معاشرہ میں ضم ہونے اور اپنے جدا جدا فرائض پر توجہ دینے کی وجہ سے "ایک کل" کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں یہ "کل" اپنی جگہ کامل ہے کیونکہ یہ انسانی ذہن کے مشترک جذبہ کا عکس ہے۔ ریاستی انصاف شہریوں کا یہ احساس ہے کہ وہ دنیا کے سامنے جاتے ہے

پیشتر اپنے مخصوص مقامات پر اپنے فرائض کی انجام دہی کا شعور رکھتے ہوں۔ انصاف کا یہ نظریہ "انفرادیت" (فرد پرستی) کے خلاف جاتا ہے۔ یہ نظریہ یہ ثابت کرتا ہے کہ فرد کوئی الگ شے نہیں بلکہ ایک نظام کا حصہ ہے۔ اس کا مقصد کسی دوسرے فرد کی ذاتی خوشی چاہنا نہیں بلکہ اس نظام میں ایک مخصوص جگہ کو پر رکھنا ہے۔ فرد جز ہے کل نہیں اور نہ ہی اسے حیثیت کل مانا جا سکتا ہے۔ ریاست "کل" کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے حق ہے کہ فرد سے اپنی ہر حیثیت منوائے اور اسے اپنے حصہ یا جزو قرار دے۔ افلاطون کا یہ نظریہ فرد کے حقوق پر بحث نہیں کرتا بلکہ فرد کے فرائض کی بات کرتا ہے۔

جیسے ریاست کے ہر طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی دیانتداری سے انجام دے۔ اسی طرح فرد کے انصاف کے معنی ہیں کہ فرد کے ذہن کا ہر حصہ اپنے مخصوص فرائض درست طریقے پر سر انجام دے اور یہی ریاستی انصاف ہے۔ انسانی ذہن کے تین حصے، ریاست کے تین طبقوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جس طرح ریاست کے تینوں طبقات اپنے اپنے مقامات پر قائم ودائم رہ کر مصروف کار ہیں اسی طرح فرد کے ذہن کے تینوں حصے اشتہا، جذبہ اور ادراک اپنا اپنا کام کریں۔

فرد کا انصاف عوامی اور ذاتی دونوں لحاظ سے اہم ہے کیونکہ یہ معاشرہ اور فرد کی ذات، دونوں کی بہبود کا تحفظ کرتا ہے۔ ریاست کے جزو ہونے کی حیثیت سے فرد اپنے فرائض سر انجام دے کر انصاف کا اظہار کرتا ہے جبکہ بحیثیت فرد کے اس کے ذمہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کے تینوں حصوں سے صحیح کارکردگی کا اظہار کرے۔ اس طرح ریاستی انصاف کی صورت میں وہ ریاست کا فرد ہوتا ہے اور انفرادی انصاف کے وقت وہ اپنے ذہن میں سب کچھ کرتا ہے۔

افلاطون کے مطابق آفاقی انصاف صرف مثالی ریاست میں حاصل ہو سکتا ہے اور مثالی ریاست وہ ہے جو مناسب تعلیم، نظریہ اشتراکیت، تخصیص فرائض اور فلسفی فرماں روا کی حکومت پر مشتمل ہو۔ وہ قانونی انصاف کو آفاقی انصاف کی نسبت بہت کمزور اور

پر عیب سمجھتا ہے کیونکہ اس میں دانا بادشاہ کی فراست جیسی پختگی نہیں ہو سکتی۔

بارکر کی نظر میں افلاطون کا یہ نظریہ انصاف "قانونیت" کے دائرہ عمل کی بجائے معاشرتی اخلاق سے متعلق ہے جبکہ معاشرتی اخلاقیات معاشرتی تعلقات استوار کرنے کا ذریعہ ہے یہ نظریہ انصاف ان ذرائع سے بحث کرتا ہے جن کی بدولت سارا معاشرہ اچھائی اور معاشرتی خوشحالی حاصل کر سکتا ہے اس نظریہ کی اصل روح رواں یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ عمل میں اپنے اپنے فرائض سر انجام دے۔ اس کلیہ کے پس منظر میں اور اس معاشرتی اخلاقیات کے تصور کے پس پشت یہی اصول ہے کہ معاشرہ ایک اخلاقی کل یا اخلاقی تنظیم ہے جو اخلاقی زندگی کا ترجمان ہے اور ہر فرد اس کا جزو یا حصہ ہے اور ہر فرد اپنا ذریعہ کار رکھتا ہے۔

افلاطون کا نظریہ کمیونزم

قدیم دور میں ایتھنز میں ذاتی املاک، کانوں اور جنگلات وغیرہ پر حکومتی تسلط قائم تھا۔ زمین مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھی اور اس پر مختلف قبائل اور گروہ قابض ہوتے تھے۔ سپارٹا میں اگرچہ ذاتی ملکیت کا رواج تھا لیکن ایسی اراضی جسے مزارع کاشت کرتے تھے قومی ملکیت تصور ہوتی تھی اور اس کی پیداوار پر تمام شہریوں کا حق ہوتا تھا۔ کریٹ میں عوامی زمینوں کو مزارع کاشت کرتے تھے اور ان کا مالیہ حکومت کے ہونے والے متفرق اخراجات پر صرف کیا جاتا تھا۔ اس طرح افلاطون کے دور میں لوگ املاک کی کمیونزم سے آگاہ تھے۔ افلاطون نے بھی فیثا غورثی مقولہ "دوست کا مال اپنا ہی مال ہے" کے تحت الجمہوریہ میں اپنے نظریات پیش کیے جس کی بنا پر اسے سیاسی فلسفے کی تاریخ میں دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اشتراکیت پسند کہا گیا ہے۔

افلاطون کے نزدیک حکمران طبقہ ادراک اور فوجی جذبہ مدافعت کے نشان ہیں اس لیے حکمران طبقہ کا کام صرف ریاست کی بھلائی اور فوجی کا کام صرف اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف نبرد آزمائی کرنا ہے۔ لہٰذا ان طبقوں کو مزدور طبقہ اشتہا کے جذبات سے پاک رہنا چاہیے اور یہ کمیونزم کے باعث ہی ممکن ہے۔ اس کے خیال میں کمیونزم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ حکمران طبقہ کو ریاست کا محافظ بنا دیتی ہے اور وہ خود کو ریاست کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اس کے خیال میں سیاسی طاقت اور اقتصادیات کا ایک شخص کے ہاتھ میں آجانا دیانت داری اور قوت عمل کے لیے نقصان دہ ہے۔ لہٰذا حکمرانوں

کو سونے چاندی سے محروم رکھنا چاہیے۔اس کے نزدیک حکمرانوں میں پیدا ہونے والی بے راہروی کا سبب سیاسی اور اقتصادی قوتوں کا یکجا ہونا ہے۔سیاسی قوت کا مالک معاشی ضروریات ومفادات کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور دانائی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک کیمونزم صرف دو طبقات تک محدود ہونا چاہیئے جبکہ تیسرا طبقہ اس پابندی سے مستثنیٰ ہے اور اپنی ذاتی املاک رکھ سکتا ہے۔بارکر کے مطابق افلاطونی اشتراکیت ایسا نظام ہے جو معاشرے کے اقتصادی ڈھانچہ کو متاثر نہیں کرتا بلکہ انفرادیت پسندانہ نظام پیداوار کو باقی رکھتا ہے اور کسی بھی کاشتکار کو متاثر نہیں کرتا۔ حکمران طبقہ اپنی جائیداد نہیں رکھ سکتا۔ان کے مکانات بھی نہیں ہوتے اور وہ کھلی بیرکوں میں رہتے ہیں۔زر،زن،زمین اور گھر کے بغیر محافظ طبقہ کو رہنا ہوتا ہے اور کاشتکاروں کی طرف فراہم کردہ اجناس پر گزر کرنی ہوتی ہے۔

افلاطون الجمہوریہ میں دو قسم کی املاک اور ازواج کی کیمونزم کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محافظ طبقہ صرف اتنی ہی جائیداد رکھ سکے گا جو کہ ازبس ضروری ہے اور فالتو املاک سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔نہ تو ان کا ذاتی مکان ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی جائے قیام جس میں داخلہ کے لیے اس کی اجازت درکار ہو۔اس کی رہائش ایسی ہونی چاہیئے جیسے تجربہ کار جنگجو لوگوں کی جن میں بردباری اور جرات دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔انہیں رعایا سے صرف اتنا ٹیکس لینا ہوگا جو پورے سال کے اخراجات کے لیے کافی ہو۔انہیں اکٹھا ایک ہی میز پر مل کر کھانا ہوگا اور خیمہ نما رہائش گاہ میں سپاہیوں کی طرح رہنا ہوگا وہ سونا چاندی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے اور نہ ہی ایسی جگہ جائینگے جہاں سونا چاندی ہو نہ ہی ان دھاتوں کو استعمال کرینگے اور نہ ہی ان کے بنے ہوئے برتنوں میں کھائیں پئیں گے۔ان ہی باتوں میں ان کی فلاح ہے اور وہ اسی طرح رہ کر ریاست کی فلاح کا باعث بن سکتے ہیں اور اگر کبھی بھی انہوں نے مکان، زمین یا زر کے حصول کی کوشش کی تو پھر وہ ریاست کے محافظ نہ رہیں گے بلکہ گھروں کے محافظ اور کنبے کے چوکیدار بن جائینگے وہ

شہریوں کے معاون و مددگار نہ رہیں گے بلکہ ان کے لیے دشمن ثابت ہونگے۔

افلاطون اشتمالیت املاک کے ساتھ ساتھ اشتمالیت ازواج کے نفاذ کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ عورتوں کی مردوں جیسی تعلیم، حکمرانوں کا گھریلو زندگی سے آزاد رہنا اور حکومت کی سرپرستی میں عارضی شادی کے تصورات افلاطون سے قبل یونان میں رائج تھے۔ یہ تصور اس دور کے ہیلنی نظام اور عصری ادب میں موجود تھا۔ ہیروڈوٹس کے مطابق اگاتھائسنین (Agatnysiane) اپنی عورتیں مشترک رکھتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی جانیں اور ایک دوسرے کے رشتہ دار ہونے کے ناطے ایک دوسرے سے رشک و حسد کے جذبات نہ رکھیں۔

سورماتی عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر شکار کھیلتی تھیں اور جنگ میں برابر حصہ لیتی تھیں۔ سپارٹا میں شوہر اپنی بیوی کو اولاد اور ریاست کی بہبود کی خاطر عاریتاً دوسرے کے سپرد کر دیتا تھا۔ یونانی لڑکیوں کی شادی اوائل عمر میں ہو جاتی تھی اور وہ قریباً پندرہ سال کی عمر میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ دوسرے مردوں سے بھی تعلقات قائم کرتی تھیں۔ شادی کوئی عہد مقدس نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد ریاست کے لیے جائز اولاد پیدا کرنا تھا۔ بارکر کے مطابق ان تصورات کا کچھ حصہ افلاطون نے اپنایا اور کچھ کی مخالفت کی۔ اس کے نزدیک شادی کوئی مقدس عہد نہیں تھا لیکن وہ عصری یونان کی اس روائت کے بھی خلاف تھا کہ عورتوں کو عزلت نشینی اور خلوت کے لیے مجبور کیا جائے۔ وہ گھریلو زندگی کو خود غرضی کی آماجگاہ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا اور اسی باعث وہ خاندان کو ریاست مین مدغم کرنا چاہتا تھا۔

افلاطون کے نزدیک عورتوں کو نظر انداز کرنا ریاست کی آدھی آبادی کو ریاستی کاموں سے مستثنیٰ کرنا ہے۔ عورت اور مرد میں بلحاظ انسان کوئی فرق نہیں ہے۔ اگرچہ صلاحیتوں کے لحاظ سے عورت مرد سے کمزور ہے مگر پھر بھی کچھ عورتیں ذہنی طور پر مردون کے ساتھ مل کر حکمرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہیں۔ ایسی ہی عورتوں کو

مردوں جیسی تربیت دے کر حکمرانوں کے دوش بدوش حکمرانی کا کام سونپنا چاہیئے۔ وہ انتظامی اور فوجی دونوں شعبوں میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ محنتی کاموں کے لیے عورت کو چالیس سال کی عمر میں اور مرد کو تیس سال کی عمر میں کام کرنا چاہیئے اور فوجی شعبہ میں مرد کو بیس سے ساٹھ سال تک اور عورت کو بچے پیدا کر لینے کے بعد کی مدت سے پچاس کی عمر تک کام کرنا چاہیئے۔ قوانین میں اس نے ایسی ہی دس نرسوں اور دس قانون محافظ عورتوں کا ذکر کیا ہے۔

افلاطون نے اپنے فلسفہ اشتراکیت کے ذریعے جس طرح حکمرانوں اور فوجی طبقوں کی توجہ ذاتی جائیداد کی ذاتی مفاد کی بجائے اجتماعی مفاد پر مرکوز کی ہے اسی طرح خاندانی اشتراکیت کے ذریعے حکمرانوں اور فوجی افسران کی توجہ اپنی ذاتی اولاد سے ہٹا کر قوم کے مشترکہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور بھلائی پر مرکوز کی ہے۔ افلاطون کے مطابق جس طرح حکمرانوں اور فوجی و سول افسران کو اگر ذاتی جائداد اور دولت رکھنے کی اجازت دی جائے تو ان کی توجہ قومی یا عوامی مفاد کے کاموں سے ہٹ جائے گی اور وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی مفادات کو قومی یا اجتماعی مفادت پر ترجیح دینے لگ جائیں گے بالکل اسی طرح مال و دولت کی طرح ہر انسان کے دل میں اپنی ذاتی اولاد کی بہت محبت ہوتی ہے اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی اولاد چاہے کسی بڑے عہدے یا اعلیٰ منصب کے لیے اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے اہل ہو یا نہیں اسے ضرور کوئی بڑا عہدہ یا اعلیٰ منصب مل جائے۔ اسی طرح حکمران طبقہ اور سول و فوجی افسران ضرور یہ کوشش کریں گے کہ چاہے ان کے بچے ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے ریاست کی حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے اہل ہیں یا نہیں انہیں ہر حالت میں بڑے عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہونا چاہیے۔ اس طرح چھوٹے طبقے کے ذہین اور قابل بچوں کی حق تلفی ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ لہٰذا ایسی غیر اخلاقی اور غیر منصفانہ کاروائیوں کو روکنے کے لیے خیالی ریاست میں بچوں کی ابتدائی نگہداشت کے لیے نرسریوں کا

سسٹم متعارف کروایا گیا جن میں ریاست کی حکومت کی طرف سے مقرر یا تعینات شدہ تربیت یافتہ نرسیں اور دوسرا ضروری عملہ بچوں کی پرورش کرے گا اور نرسریوں کا انتظام ایسا خفیہ اور سخت ہو گا کہ اصل والدین کو اپنے بچوں کی اور بچوں کو اپنے ماں باپ کی پہچان نہ ہونے دی جائے گی چونکہ والدین کو اپنے اصلی بچوں کی پہچان نہیں ہو گی لہذا نرسری میں پرورش پانے والے ہر شخص ہر بچے یا بچی کو اپنا ذاتی بچہ یا بچی سمجھنے پر مجبور ہو گا اور ریاست کی طرف سے قائم شدہ سکولوں میں داخل ہونے پر انہیں اپنی فطری ذہنی و جسمانی صلاحیت کے مظاہرے کے یکساں مواقع میسر ہوں گے۔

افلاطون کے نزدیک شادی ایک سنجیدہ اور مخصوص جنسی تعلق کی منفرد اور پاکیزہ صورت ہے جس کا مقصد نسل بڑھانا ہے۔ عارضی شادیوں کی تعداد کا انحصار شہری ریاست کے تناسب آبادی پر ہو گا۔ نہ والدین اپنے بچوں سے واقف ہونگے اور نہ ہی بچے اپنے والدین کو جانتے ہونگے۔ اس طرح سارا حکمران طبقہ ایک ہی کنبہ بن جائیگا اور ریاست ہی اس کا گھر ہو گا اور وہ ریاست کے رہنے والوں کے غم اور خوشی سے مساوی طور پر متاثر ہو گا۔

افلاطون کے نزدیک محافظ مرد اور عورتوں کے بیرکس میں اکٹھے رہنے سے ان کے درمیان جنسی تعلقات قائم ہونگے اور افزائش نسل کے نظریہ سے بہترین اولاد جنم لے سکے گی۔ اس کے خیال میں اگر یہ بات گھوڑوں کی نسل، محافظ کتوں کی نسل یا شکاری پرندوں کی نسل کے لیے درست ہے تو انسانوں کے لیے بھی ایسے ہی درست ہے۔ حکمران طبقہ میں سے صحت مند اور عالی دماغ مرد و عورت کو مناسب عمر میں اور مناسب موسم میں عارضی شادی کر لینی چاہیے اور ان کی اولاد کی پرورش حکومت کا کام ہو گا۔

افلاطون کے نزدیک نہ کنبہ ہو گا اور نہ ہی حکمران ذاتی مفاد اور ریاستی مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہونے دے گا۔ اس کے خیال میں ہر سال مناسب موسم میں عارضی جنسی تعلقات سے جو اولاد ہو گی ان کے کوائف مخفی رکھے جائینگے۔ ایک موسم میں جتنے

جوڑے شادی کریں گے انہیں اولاد کی پیدائش پر بتا دیا جائے گا کہ ان کی اولاد ہو گئی ہے اور یہ اولاد سب کی اولاد ہے اور اولاد کو بھی سکھایا جائے گا کہ تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو یا بھائی بہن ہو۔ اس طرح تمام حکمران خود کو ایک ہی کنبہ تصور کریں گے جس سے اتحاد پیدا ہو گا۔

افلاطون کے نزدیک بہترین محافظ عورت و مرد کو جنسی تعلقات قائم کر لینے چاہیں اور پھر اولاد کی پرورش اعلیٰ درجہ پر ہونی چاہیے ایسی اولاد یقیناً عمدہ ذہنی و جسمانی خوبیوں سے مالامال ہو گی۔ اس کے خیال میں اچھی نسل اچھے والدین سے جنم لیتی ہے بشرطیکہ والدین اپنی بلوغت اور جوانی کی حالت میں ہوں۔ شادی کے وقت عورت کی عمر بیس سے چالیس سال تک اور مرد کی عمر پچیس سے پچپن سال تک ہونی چاہیے۔ اس کے خیال میں ان عمروں کے علاوہ کسی بھی عمر میں کوئی اولاد کسی والدین سے ہو جائے تو وہ اولاد موت کے گھاٹ اتار دی جائے۔

بارکر کے مطابق افلاطون کی زہدانہ اشتمالیت کو اشرافیانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ سپر اندازی کا ایک طریقہ ہے اور یہ سپر انداز صرف اصلاح پر لاگو ہوتی ہے۔ اشتمالیت تمام معاشرہ کی خاطر وجود پذیر ہے لیکن تمام معاشرہ کی بجائے یہ صرف حکمران طبقہ میں وجود پذیر ہے۔ لہٰذا اسے معاشی کیمونزم کی بجائے سیاسی کیمونزم کہنا چاہیے۔ جس کا مقصد تربیت یافتہ اور پیشہ ور حکومت ہے جسے باقاعدہ ٹیکس کی مراعات حاصل ہوں۔ نیٹروپ کے مطابق افلاطونی کیمونزم نصف کیمونزم ہے۔ کیونکہ یہ سارے معاشرے پر لاگو نہیں ہوتی ارسطو نے افلاطونی اشتمالیت املاک پر زبردست تنقید کرتے ہوئے درج ذیل اعتراضات اٹھائے ہیں۔

1۔ اشتمالیت انسانی نفسیات کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔
2۔ معاشرہ کے تیسرے طبقہ (مزدور پیشہ طبقہ) کو نظر انداز کر دیتی ہے۔
3۔ اس اشتمالیت سے سخاوت، مہمان نوازی اور احسان کے جذبے ختم ہو جائیں گے۔

4۔ یہ ریاست کی انتہائی یکجہتی کی حامی ہے۔
5۔ ریاستی یگانگت اعلیٰ تعلیم سے پیدا کرنی چاہیئے نہ کمیونزم سے۔ کمیونزم سے بے جان یگانگت پیدا ہوتی ہے۔
6۔ انسانی تجربات اشتمالیت کے خلاف ہے۔
7۔ اشتمالیت کے دور میں ریاست کو دو طبقات میں تقسیم کر دینا ریاستی یکجہتی کے منافی ہے۔
8۔ اشتمالیت میں مشترکہ غفلت کی وجہ سے بے اعتنائی، کم رفتاری اور کم پیداواری جنم لیتی ہے اور افلاطون نے اشتمالیت پیش کر کے روحانی عوارض کے لیے مادی علاج تجویز کیا ہے۔
9۔ اشتمالیت نے فرد کو ریاست کی قربان گاہ پر قربان کر دیا ہے۔

افلاطونی اشتمالیت ازواج پر ارسطو تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

۱۔ ریاست میں یک جہتی پیدا کرنے کی بجائے اشتمالیت ازواج ریاستی انتشار اور افتراق کا باعث ہے۔
۲۔ ایسے معاشرتی نظام میں جہاں اشتمالیت کی بدولت ہر آدمی دوسروں کی ذمہ داری سے بیگانہ ہو اور دوسرے اس کی ذمہ داری سے بیگانہ ہوں تو پھر مشترکہ اولاد کی حفاظت اور پرورش کا خیال کون کرے گا۔
۳۔ اشتمالیت ازواج سے خدشہ ہے کہ کوئی شخص قریب ترین عزیز سے ہی جنسی ملاپ نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ کئی رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو تقدیس کا نمونہ ہوتے ہیں اور ان کی حرمت مسلم ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اشتمالیت کا نظام غیر شائستگی کا نمونہ ہے۔
۴۔ ازواج کو جانوروں کی دنیا سے مشابہ قرار دیکر تشبیہات کا سہارا لینا اور اپنے دلائل ثابت کرنا مضحکہ خیز ہے۔
۵۔ ریاستی انتظام کے زیر عمل ہونے والے جنسی ملاپ سے ضروری نہیں کہ عمدہ اور بہترین اولاد پیدا ہو اور صرف طاقتور ترین جوڑے ہی ملاپ کریں۔

۶۔ اس اشتمالیت سے حکمران طبقہ خوش نہیں رہ سکتا۔

۷۔ اشتمالیت املاک کی طرح اشتمالیت ازواج بھی آبادی کے اکثریتی طبقہ پر لاگو نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف حکمرانوں اور فوجی طبقہ پر لاگو ہوتی ہے اور اس طرح آبادی کا بڑا حصہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۸۔ عورتوں کی آزادی سے گھریلو زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔

۹۔ اشتمالیت ازواج سے راست روی کا جذبہ ختم ہو جائے گا جبکہ راست روی بہترین کردار کی ضامن ہے۔

۱۰۔ ریاست کو ایک خاندان بنانے کے خیال میں افلاطون اتنی دور نکل گیا ہے کہ اس نے ریاست کی خود مختاری کو فراموش کر دیا ہے۔

فلسفہ خیالات

افلاطون کی تھیوری آف آئیڈیاز کی بنیاد سقراط کی تھیوری آف نالج پر ہے۔اس تھیوری کی ابتدا"علم کیا ہے"اور "حقیقت کیا ہے" سے کرتے ہوئے وہ علم یا حقیقت کے متعلق پروٹے گورس کے اس نظریہ کو کہ "حواس خمسہ علم ہے اور جو چیز جس آدمی کو جیسی نظر آتی ہے وہ اس کے لیے ویسی ہی ہے"کو رد کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ حواس خمسہ کے محسوسات یا حواس خمسہ کا عمل علم نہیں بلکہ یہ ایک دھوکا اور فریب ہے۔

اولاً حواس خمسہ کے عمل کے ذریعے مستقبل کے واقعات یا حالات کی پیشگوئی ممکن نہیں ہے۔ایک شخص کی سوچ ہے کہ وہ اگلے سال چیف جسٹس ہوگا لیکن وہ اس کے برعکس قیدی بن جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیشن گوئی کا درست ہونا ضروری نہیں ہے۔دوم حواس خمسہ کے تاثرات عموماً متضاد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک چیز دور سے چھوٹی نظر آتی ہے جبکہ قریب سے بڑی۔ایک چیز سرخ روشنی میں سرخ نظر آتی ہے نیلی روشنی میں نیلی اور اندھیرے میں اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ایک چیز کو اگر ایک مخصوص زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ ایک خاص صورت میں نظر آتی ہے جبکہ زاویہ بدلنے سے اس چیز کی صورت بدلی ہوئی نظر آتی ہے سوم اگر حواس خمسہ کا عمل علم ہے تو حواس خمسہ کے عمل کے تمام تاثرات درست ہونے چاہئیں جبکہ ایک چیز کے بارے میں دو آدمیوں کی حث دو مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے اور ان دونوں کے تاثرات سے ہٹ کر اصل حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔چہارم اگر حواس خمسہ کا عمل علم ہے تو پھر ایک جانور جو

محسوس کرتا ہے یا سمجھتا ہے وہ بھی علم ہے۔ پنجم پروٹے گورس کا یہ کہنا کہ ایک چیز ایک آدمی کو درست نظر آتی ہے تو وہ اس کے لیے درست ہے اور اگر وہی چیز دوسرے شخص کو غلط نظر آتی ہے تو وہ اس کے لیے غلط ہے بذات خود اس کے نظریہ کی نفی کرتا ہے مزید اس کا یہ فلسفہ درست اور غلط، جائز اور ناجائز، روا اور ناروا، انصاف اور بے انصافی میں فرق نہیں کرتا۔ ششم علم صرف حواس خمسہ کے اعمال پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس میں عقل کے عمل کی شمولیت ضروری ہے۔ دماغ کے عمل کا نام سوچنا ہے اور دماغ حواس خمسہ سے ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کا عمل بھی ان کے اعمال سے علیحدہ ہے۔ دماغ حواس خمسہ سے برتر ہے اور اس کا عمل بھی حواس خمسہ کے اعمال سے برتر حیثیت کا حامل ہے۔

افلاطون کے نزدیک کسی چیز کے بارے میں حقیقی علم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عالم اس بات سے ہی واقف نہ ہو کہ یہ چیز ایسی ہے یا اسطرح ہے بلکہ اس کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ یہ چیز ایسی کیوں ہے۔ کسی تبدیلی کے بغیر حقیقی علم اس چیز کے "خیال یا تصور" کے اندر پنہاں ہے اور ایک خیال یا تصور ایک وضاحت کے مماثل ہوتا ہے اور یہ وضاحت اور تصور حتمی اور آفاقی ہوتا ہے اور یہ کسی فرد کی ذاتی رائے یا تاثر کا تابع نہیں ہوتا۔ وہ ایک معروضی حقیقت ہوتا ہے۔ اس کا اپنا وجود اور اپنی حقیقت ہوتی ہے اور کوئی شخص اپنی ذاتی رائے یا تاثر سے اس معروضی حقیقت کے باوجود اصلیت کو تبدیل نہیں کر سکتا اور ایک خیال یا تصور یا وضاحت کی بنیاد عقلی استدلال پر ہوتی ہے۔

جدلیات کے لفظی معنی کسی چیز کے بارے میں عقلی بحث مباحثہ ہے۔ سقراط کے مطابق جدلیات کا مطلب خیالات کا اصول ہے اور اس کا یہ نظریہ رہا ہے کہ جدلیات کے ذریعے خیالات کو ترتیب دیا جاتا ہے افلاطون بھی جدلیات کے ذریعے اپنے مادی خیالات کو تجریدیت میں تبدیل کرتا نظر آتا ہے۔ افلاطون کی تھیوری آف آئیڈیاز کا نچوڑ یہ ہے کہ کسی چیز کا تصور دماغ میں پیدا ہونے والا صرف ایک خیال ہی نہیں بلکہ ایک

معروضی حقیقت ہے اور وہ معروضی حقیقت دماغ کے باہر اور خود مختار ہے اور سچائی کا مطلب معروضی حقائق سے مطابقت ہے۔ اگر مجھے اپنے سامنے پانی کی ایک جھیل نظر آتی ہے اور حقیقت میں وہ جھیل بالکل اسی طرح ہے تو میرا خیال سچا ہے اور اگر حقیقت میں میرے خیال جیسی کوئی جھیل اپنا وجود نہیں رکھتی تو پھر میرا خیال غلط ہے۔ لیکن یہ ایک فریب اور ایک خیال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے دماغ کا خیال دماغ سے باہر کسی وجود رکھنے والی چیز کی نقل ہے۔

افلاطون کے نزدیک حواس خمسہ صرف انفرادی اشیاء کو محسوس کرنے میں جبکہ ذہن یا شعور اس چیز کا ایک عمومی افاقی تصور پیش کرتا ہے۔ حواس خمسہ یا آنکھوں سے دیکھے جانے والے گھوڑے یا ہاتھوں سے چھوئے ہوئے تمام بڑے چھوٹے یا کالے یا سفید گھوڑے اصل میں ایک فریب ہیں جبکہ گھوڑے کا وہ عمومی تصور اصلی ہے جو "intellect" کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ کسی چیز کی اصل حقیقت اس چیز میں نہیں بلکہ اس کے تجریدی تصور میں پنہاں ہے۔ یعنی اصل چیز عدم وجود یعنی not being ہے جبکہ اس چیز کا تصور یا خیال اصل وجود یا being ہے۔

موت کی اصل حقیقت موت میں نہیں بلکہ موت کے خیال میں پنہاں ہے یا زندگی کی اصل حقیقت بذات خود زندگی میں نہیں بلکہ زندگی کے تجریدی خیال میں ہے۔ ایک خیال یا تصور اپنی ذات میں مکمل چیز اور خود کفیل ہے۔ اسے اپنی ذات کی وضاحت کے لیے کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں بلکہ ایک خیال یا تصور خود اپنی وضاحت ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک حتمی اور مکمل حقیقت ہے۔ اور اس کا وجود اس کی اپنی ذات میں پنہاں ہے۔ ان عمومی خیالات کا انحصار کسی بیرونی مادی چیز پر نہیں بلکہ بیرونی مادی اشیاء کا انحصار ان آفاقی تصورات یا خیالات پر ہے اور یہی خیالات اس کائنات کی تخلیق کا پہلا اصول ہے یہ تصورات آفاقی ہیں اور یہ خیال ایک اکائی ہے۔ مثلاً دنیا میں گھوڑے لاکھوں ہزاروں ہیں لیکن گھوڑے کا "عمومی تصور" صرف ایک ہے۔ اسی طرح انصاف سے مماثل بہت سے اعمال ہو

سکتے ہیں لیکن انصاف کا عمومی تصور صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ یہ عمومی تصورات غیر متغیر اور غیر فانی ہیں اور ان آفاقی تصورات کی حیثیت وضاحت جیسی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں ہے۔ ان کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا اور یہ کہ مادی اشیاء فانی ہیں' جبکہ ان کے آفاقی تصورات جو ایک وضاحت کی مانند ہیں غیر فانی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر دنیا کے سارے انسان مر بھی جائیں تو انسان کا ایک آفاقی تصور جو لفظ "انسان" کی وضاحت کی حیثیت رکھتا ہے ہمیشہ قائم رہے گا اور یہ کہ یہ اشیاء کی اصل حقیقت ہیں۔ اس کی ایک مثال یوں ہے کہ اگر ہم کہیں کہ انسان ایک عقلی جانور ہے تو انسان کی اصل حقیقت اس کی عقلیات میں ہے نہ کہ اس کے جانور ہونے میں۔

افلاطون کے خیال میں ہر تصور اپنی قسم کا ایک منفرد تصور ہے اور وہ ایک حتمی اور مکمل حقیقت ہے۔ مثلاً انسان کا ایک تصور ہے اور وہ ایک مکمل انسان کا تصور ہے۔ انسان کے اس تصور میں اس کی جسمانی تکمیل اور خوبصورتی بھی شامل ہے اور اس کی عقلی اخلاقی صفات بھی اس تصور میں موجود ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ دنیا کے تمام انسان جسمانی اور عقلی واخلاقی لحاظ سے "انسان کے اس آفاقی تصور" کے مطابق ہوں یا اس پر پورے اتریں۔ اور یہ کہ یہ آفاقی تصورات زمان ومکان کی حدود وقیود سے باہر ہیں۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ تصورات مادی اشیاء نہیں بلکہ وضاحت کے طور پر عمومی خیالات ہیں۔ اور یہ کہ ان کی نمایاں صفت یہ ہے کہ انہیں صرف عقلی استدلال "Reason" سے پہچانا جاسکتا ہے لیکن حواس خمسہ کے افعال سے انہیں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ کہ یہ نہ صرف زمان ومکان کی حدود وقیود سے باہر ہیں بلکہ ان کا زمان و مکان سے کوئی خاص ربط یا تعلق بھی نہیں۔ بلکہ یہ دائمی ہیں۔

خیالات کا اصل جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود Absolute Being ہے۔ جبکہ حواس خمسہ کا جہاں ایک مکمل یا حتمی غیر حقیقت Absolute Unreality یا عدم وجود Absolute Unbeing ہے ماسوائے اس کے

کہ یہ خیالات اشیاء میں پنہاں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ آفاقی تصورات وجود اور عدم وجود کے درمیان ہیں۔ کسی چیز کا آفاقی تصور ایک ہوتا ہے جبکہ چیزیں لامحدود۔ خیال زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے جبکہ مادی اشیاء زمانی بھی ہیں اور مکانی بھی۔ خیال دائمی اور غیر متغیر ہے جبکہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ اشیاء خیالات میں شامل ہوتی ہیں یا شمولیت کرتی ہیں۔ سفید رنگ کی چیزیں سفیدی کے خیال میں شمولیت کرتی ہیں۔ اس طرح خوبصورت اشیاء خوبصورتی کے ایک آفاقی تصور میں شمولیت کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے خوبصورتی کا تصور خوبصورت چیزوں کی نہ صرف وضاحت پیش کرتا ہے بلکہ یہ تصور ان چیزوں کی علت کا کردار بھی ادا کرتا ہے اور وہ چیزیں اس علت کا حصول ہیں۔ لہٰذا اس اصول کے مطابق یہ خیالات خود تخلیقی "ذاتی" یعنی self created ہیں اور ان چیزوں کے وجود کے مرہون منت نہیں بلکہ وہ چیزیں اپنے وجود کی مکمل پہچان، شناخت یا وضاحت کے لیے ان تصورات کی محتاج ہیں اور جس قدر یہ چیزیں ان آئیڈیاز کے مطابق ہونگی یہ زیادہ اصلی اور حقیقت ہونگی۔ اور جوں جوں چیزوں کی تصور سے مماثلت کم ہوگی ان کی اصلیت بھی کم ہو جائے گی۔

افلاطون کے نزدیک تصورات کی تین قسمیں ہیں۔ اخلاقی تصورات جیسے انصاف ,نیکی اور خوبصورتی۔ مادی اشیاء کے تصورات جیسے گھوڑا,انسان, درخت, ستارے اور دریا وغیرہ۔ خصوصیات یا صفات کے تصورات جیسے بہادری ,ہمدردی, سفیدی, بھاری پن,یا مٹھاس وغیرہ۔ پھر اچھائی کے ساتھ برائی, نیکی کے ساتھ بدی, اور انصاف کے ساتھ بے انصافی کے تصورات بھی موجود ہیں۔ اگر واحد یا ایک کا تصور ہے تو متعدد یعنی زیادہ کا تصور بھی لازمی ہے۔ کیونکہ جب ہم ایک چیز کے وجود کا اقرار کرتے ہیں تو دراصل ہم اس چیز کے متضاد کا بھی اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ بہادری ایک تصور ہے تو دوسری طرف ہم خود بخود بزدلی کے تصور کا بھی اقرار کرتے ہیں۔

تصورات کی درجہ بندی یا Classification بھی ہے۔ جس طرح ایک آفاقی

تصور ایک جیسی بہت سی چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے اسی طرح ایک بلند تر تصور اپنے سے چھوٹے تصورات کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ اس بلند تر تصور کی صفات ان چھوٹے تصورات میں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے سفیدی، نیلا پن اور سرخی سب چھوٹے تصورات ہیں اور یہ ایک بڑے تصور رنگ (colour) کے تحت آتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک تمام تصورات مل کر ایک سب سے بڑے تصور کے تحت آتے ہیں اور یہ سب سے بڑا تصور ایک حتمی مکمل حقیقت اور جواز کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ جواز اس کے اپنے ہونے اور دوسرے تمام تصورات کے ہونے کا بھی ہے اور یہی جواز پوری کائنات کا سب سے بڑا تصور اور خیال ہے اور یہ سب سے بڑا تصور یا خیال خدا کل ہے۔ خدا خالق ہے اور پوری کائنات کو چلاتا ہے اور اس کا حکمران ہے اور تمام انسانوں کی زندگیوں کی رکھوالی کرتا ہے۔

افلاطون کے خیال میں آفاقی خیالات اصل وجود ہیں اور حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء نیم حقیقی اشیاء اور نیم غیر حقیقی ہیں۔ نیم حقیقی اس لیے کہ یہ وجود میں شامل ہیں اور نیم غیر حقیقی اس لیے کہ وہ عدم وجود میں بھی شامل ہیں عدم وجود کا حقیقی اصول مادی آفاقی تصورات پر مہر کی طرح لگ کر مادے کو چیزوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح انسان کے آفاقی تصور نے مادے کو انسانی شکل دی۔ زیلر (Zeller) کے تبصرہ کے مطابق اس قسم کے مادے سے افلاطون کی مراد محض خالی خلا ہے اور یہ خالی خلا ایک وجود رکھنے والا بالکل غیر متعین اور بے شکل ہے۔

افلاطون نے اپنے ان نظریات میں نہ تو ہر آفاقی تصورات سے اشیائی کی تخلیق کے اصول بیان کئے ہیں اور نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ خالق وجود ہے یا ایک آفاقی تصور اور اگر اکائی تصور ہے تو اس نے وجود کی تخلیق کیسے کی۔

افلاطون کا فلسفہ محبت

افلاطون کے نزدیک ایک انسانی روح جو انسانی جسم میں حرکت کی وجہ ہے دنیا کی روح کی طرح ہے اور اسی میں انسان کا عقلی استدلال پنہاں ہے۔ انسانی روح کا تعلق آفاقی تصورات اور حواس خمسہ کے دونوں جہانوں سے ہے۔ یہ پہلے دو حصوں میں اور پھر ہر حصہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ روح کا عقلی استدلالی حصہ بناوٹ میں سادہ اور ناقابل تقسیم ہے یہ آفاقی تصورات کے جہاں کا ادراک کرتا ہے اور فنا نہیں ہوتا ہے جبکہ روح کے غیر استدلالی حصے دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اچھے حصے نیک اور اچھے جذبات رکھتے ہیں جبکہ برے حصے سے حیاتی بھوک کا تعلق ہے۔ روح نے جسم میں داخل ہونے سے قبل آفاقی تصورات کے جہاں جو کچھ دیکھا وہ جسم میں داخل ہوتے وقت اپنے ساتھ لائی وہ جسم میں داخل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ ان تصورات کو یاد کرتی ہے اور یہی علم کی اصل صورت ہے۔ یہ علم عقلی استدلال ہے جو آفاقی تصورات کے ادراک کے مماثل ہے۔

افلاطون کے نزدیک محبت کا تعلق ہمیشہ خوبصورتی سے ہے۔ کسی جسمانی شکل میں پیدائش سے قبل انسانی روح بے جسم حالت میں پڑی تھی اور تصورات و خیالات کی دنیا میں رہتے ہوئے گہری اور خالص فکر کے عالم میں تھی لیکن جیسے ہی وہ انسانی جسم میں داخل ہوئی روح حواس خمسہ کے جہاں میں ڈوب کر تصورات و خیالات کے جہاں کو بھول گئی۔ یہ انسانی روح جب حواس خمسہ کے جہاں میں کسی خوبصورت چیز کو دیکھتی ہے تو اسے خوبصورتی کے اس ایک تصور کی یاد آتی ہے جو خیالات کی دنیا میں تھا اور جب یہ روح ایک کے بعد دوسری خوبصورت چیز کو دیکھتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تو

اسی خوبصورتی کے ایک خاص تصور والی خوبصورتی ہے جو اپنے آپ کو ان خوبصورت چیزوں میں پیش کر رہی ہے۔

افلاطون کے نزدیک تصورات و خیالات کی دنیا میں بدصورتی کا تصور بھی موجود تھا اور اس دنیا کی بدصورت چیزوں میں اسی بدصورتی کے تصور کی بدصورتی جھلکتی ہے۔ روح جب ایک خوبصورت چیز سے محبت کے جذبے سے آشنا ہو جاتی ہے تو پھر وہ دوسری خوبصورت چیزوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پھر وہ خوبصورت اجسام سے خوبصورت ارواح کی طرف بڑھتی ہے اور آخرکار وہ خوبصورت علوم (Sciences) کی طرف بڑھتی ہے۔ اس طرح روح خوبصورت چیزوں پر متوجہ ہونے کے بعد خوبصورتی کے تصور پر توجہ دیتی ہے اور پھر روح کی محبت کا مرکز اصل خوبصورتی کے ایک تصور کا علم بن جاتا ہے۔ پھر وہ ان تصورات و خیالات کے پورے نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے جہانِ فلسفہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک خوبصورت یا خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے انسان میں خوبصورتی یا خوبصورتی سے جذبہ محبت اس لیے نہیں کہ وہ حواسِ خمسہ سے محسوس کرنے والا جانور ہے بلکہ محبت کا یہ جذبہ اس کے عقلی استدلال کی صفت سے متصف ہونے کے باعث ہے۔ افلاطون کے خیال میں فلسفہ کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ خود ایک عظیم مقصد ہے۔ فلسفہ کسی شے کے لیے نہیں بلکہ سب چیزیں فلسفے کے لیے ہیں۔

اخلاقیات

اخلاقیات کے حوالے سے سوفسطائیوں کا نظریہ یہ تھا کہ "فرد کا ذاتی یا شخصی مفاد ہی انسانی اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اخلاق بذات خود ایک مقصد نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد کسی فرد کا ذاتی مفاد یا ذاتی خوشی ہے"۔ سقراط کا نظریہ یہ تھا کہ " بنیادی طور پر نیکی ایک علم ہے اور ایک ایسا عالم یا دانا جو نیکی کا فہم و شعور رکھنے کے باوجود نیک یا درست عمل کرنے سے گریزاں ہے وہ اس بے علم یا نادان سے پھر بھی بہتر ہے جسے نیکی کا فہم و شعور تک نہیں"۔

افلاطون نے اخلاقیت کے بارے میں سقراط کے خیال کی تائید و حمایت کرتے ہوئے کہا کہ "اخلاقیات کسی فرد کے ذاتی مفاد کے پیش نظر قائم ہونے والے ذاتی تاثر یا ذاتی رائے سے ہٹ کر ایک الگ حیثیت کی حامل سچائی ہے اور نیکی یا اخلاق کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ بذات خود ایک مقصد ہے اور نیکی اور اخلاق کا حصول ہی انسانی زندگی کا نصب العین ہے ہمیں نیک اور اچھا کام صرف اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ نیکی اور اچھائی کا کام ہے۔ اصل نیکی اس درست عمل کا نام ہے جس کی بنیاد یا جس کا محرک نیکی کا وہ فہم ہو جس کی بنیاد عقلی استدلال پر ہو۔ روایتی یا رسمی نیکی کے اعمال اس صورت میں اچھے ہو سکتے ہیں جب ان کا ماخذ عقلی اور اخلاقی استدلال ہو ورنہ ان کی حیثیت ضمنی نیکی جیسی ہوگی۔

افلاطون کے نزدیک کچھ لوگ دوسروں کو دیکھ کر نیک یا اچھا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ نیکی کے نقال اور معمولی درجے کے ایماندار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں جیسی ہے کہ ان دونوں کی صفت یہ ہے کہ وہ اس انداز میں اپنا کام

کرتی ہیں کہ وہ واقعی عقلمند نظر آتی ہیں لیکن در حقیقت وہ اپنے کام کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہوتیں۔

افلاطون کے نزدیک نیکی کا اثر اور نتیجہ خوشی ہے لیکن یہ وہ خوشی نہیں جو ایک بے ایمان شخص کو کسی کا استحصال کر کے یا کسی کو دھوکے سے لوٹ کر یا اپنی طاقت کے باعث کسی کمزور سے اس کا حق چھین کر حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ وہ خوشی ہے جو ایک اچھے انسان کو کسی کمزور یا مظلوم کی مدد کر کے یا حق بات کے لیے جان و مال کی قربانی دے کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اچھے کاموں سے حاصل ہونے والی خوشی سچی اور حقیقی ہے جبکہ برے کاموں سے حاصل ہونے والی خوشی منافقانہ لذت ہے۔

افلاطون کا نظریہ نیکی چار عناصر پر مشتمل ہے۔

1۔ سب سے اہم آفاقی تصور کا علم ہے جو بذات خود فلسفہ ہے۔
2۔ دنیاوی چیزوں کی وضاحت کرنے والے آفاقی تصورات پر غور و خوض۔
3۔ تمام اعلیٰ درجے کے علوم و فنون کی ترویج۔
4۔ پاکیزہ اور معصوم انداز میں دنیاوی خوشیوں میں شرکت۔

متذکرہ چار عناصر میں پہلے تین حصے انسانی روح کے اچھے حصوں سے مماثل ہیں جبکہ چوتھا عنصر پہلے تین عناصر کو متحد کرتا ہے۔ پہلے تین عناصر دانائی، بہادری اور اعتدال ہیں جبکہ چوتھا عنصر جو ان کو متحد کرتا ہے انصاف ہے۔

زیلر (Zeller) کہتا ہے کہ افلاطون کے نزدیک برائی کرنا کبھی اچھا عمل نہیں رہا اور اس کے نزدیک اچھا انسان وہ ہے جو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرتا ہے۔ افلاطون کے خیال میں انسان کے اعمال کا ہر پہلو اہمیت کا حامل ہے اور ان اعمال کا امتزاج ہی سماجی نیکی کی اصل بنیاد ہے۔ ان نظریات میں افلاطون نے اگرچہ نیکی کو معلوم کرنے کے ان ذریعے یا اصول کی وضاحت کی ہے کہ نیکی کو عقلی استدلال کے

ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے لیکن نیکی یا ورچو(Virtue) کی وضاحت نہیں کی ہے اور نہ ہی سماجی نیکی اور سماجی انصاف کی کوئی حتمی وضاحت کی ہے۔

افلاطون نے اپنے استاد کے اخلاقیاتی اصولوں کو اپنی مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کے ساتھ وابستہ کر کے اس کو علمی سانچہ میں ڈھالا ہے چونکہ روح محسوسات سے بالاتر عالم سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا حقیقی اور غیر فانی وجود اسی کے اندر ہو سکتا ہے اسی لیے جو خیر و سعادت انسانی مساعی کا صحیح نصب العین ہو سکتی ہے وہ بھی روح کو اسی عالم کی طرف رجوع کرنے سے میسر آسکتی ہے جسمانی زندگی روح کا زندان اور اس کی قبر ہے اسی کی وجہ سے غیر عقلی عناصر روح کے ساتھ چمٹ گئے ہیں اور یہی عقل کے اندر ہیجانات کو پیدا کرتی اور شہوات کو ابھارتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسان کی زندگی کا صحیح مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس عالم محسوسات سے گریز کرے اور اپنی فطرت کو الٰہی فطرت کے مطابق بنائے۔ فلسفی کو چاہیے کہ وہ قبل از مرگ اس عالم میں سے مر جائے۔ لیکن چونکہ مرئی زندگی غیر مرئی زندگی کا ایک عکس ہے اس لیے یہ بھی فرض ہے کہ انسان مظاہر محسوس کو تصورات کے ادراک کا ذریعہ بنائے اور تصورات کو معروضات حواس میں داخل کرے۔

افلاطون کے نزدیک ناانصافی کرنا ظلم سہنے سے بدتر ہے اور بد عملی کے لیے سزا بھگتنا بچ جانے کی نسبت بہتر ہے۔ نیکی روح کا جمال اور اس کی صحت ہے اس لیے وہ خود ایک سعادت ہے نیکی آپ ہی اپنا اجر ہے اور بدی آپ ہی اپنی سزا۔ انسانوں کے اندر بہیمیت پر الوہیت کی حکومت ہے اور یہی انسان کی سچی آزادی اور اصلی دولت ہے اور اسی سے مستقل اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے۔

افلاطون الجمہوریہ میں ناقص نیکی کو جس کا مدار عادت اور ادراک پر ہے اس اعلیٰ نیکی کے لیے ایک لازمی تیاری خیال کرتا ہے جو حکیمانہ علم سے سرزد ہوتی ہے لیکن بعد میں وہ اس بات کو بھی مد نظر رکھنے لگا کہ اخلاقی قابلیت، مزاج احساس اور ارادے میں

تفاوت و مدارج افراد میں بھی پایا جاتا ہے اور اقوام میں بھی۔ نفسیات میں بھی افلاطون نے فضیلت کی وحدت کے ساتھ فضائل کی کثرت کو پیش کیا اور کہا کہ "ہر فضیلت کبریٰ کو روح کے اندر ایک خاص مقام حاصل ہے"۔ افلاطون کے نزدیک فضائل کبریٰ چار ہیں۔ جب عقل صحیح طور پر عمل کرے تو اس کا نام دانائی ہے جب جذبہ عقل کے مطابق چلے اور یہ بتائے کہ کس چیز سے ڈرنا چاہیئے اور کس سے نہیں ڈرنا چاہیئے تو وہ شجاعت کی صفت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب روح کے اندر یہ تنظیم پیدا ہو جائے کہ اس کا کونسا حصہ حکمران ہو اور کونسا محکوم تو اس کو تصرف نفس کہتے ہیں جس سے روح میں داخلی موافقت پیدا ہوتی ہے۔ جب روح کا ہر حصہ اپنا وظیفہ ادا کرے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے تو اس کا نام عدل ہے۔

افلاطونی مملکت کا دستور حکومت، خواصیت (Aristo cracy) ہے جس کا مطلب فلاسفہ کی ایسی حکومت ہے جن پر کسی قانون کی پابندی لازمی نہیں۔ حکمرانوں کے لیے ضروری قوت مہیا کرنے اور مملکت کو خارجی حملوں سے بچانے کے لیے سپاہیوں کا ایک طبقہ بھی لازمی ہے۔ عام لوگ کاشتکار اور صناع وغیرہ ایک تیسرا طبقہ ہے جن کو ہر قسم کے سیاسی کاموں سے بے تعلق ہونا چاہیے اور فقط روپیہ کمانا چاہیئے۔

افلاطون کے نزدیک طبقات کی یہ تقسیم، تقسیم کار پر مبنی ہے لیکن اس کا خاص محرک یہ عقیدہ ہے کہ فقط چند لوگ اعلیٰ سیاسی کاموں کے اہل ہوتے ہیں چونکہ وہ ان قابلیتوں کو موروثی بھی تصور کرتا ہے اس لیے یہ تین طبقے تین ذاتیں بن جاتی ہیں۔ افلاطون ان کو روح کے تین حصوں کے مشابہ قرار دیتا ہے ان تینوں کا اپنے اپنے وظیفے کو ادا کرنا قوم کی فضیلت ہے۔ تاکہ دو اعلیٰ طبقے اپنا کام خوبی سے انجام دے سکیں ان کی تعلیم و تربیت اور بود و باش کا انتظام کلیتہً مملکت کے سپرد اور مملکت کے اغراض کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ یہ امرائی فلسفی تیسرے طبقے کی تعلیم و تنظیم حیات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

افلاطون کے نزدیک مملکت کو اس بات کا انتظام کرنا چاہیے کہ ان طبقوں میں بہترین والدین سے نہایت موزوں حالات میں بہترین اولاد پیدا ہو۔ پھر ایسی اولاد کی تعلیم وتربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر مملکت کی جانب سے ہونی چاہیے اس تعلیم میں موسیقی اور ورزش بھی شامل ہونی چاہیے جس میں عورتیں بھی حصہ لیں۔ عورتیں انتظامی اور عسکری فرائض میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو مستقبل میں حکمران بننے والے ہیں ریاضیاتی علوم اور منطق کی تعلیم دے۔ عملی زندگی میں کئی سال بسر کرنے کے بعد جب وہ ہر طرح سے قابل ثابت ہوں تو پچاس سال کی عمر میں وہ اس اعلیٰ مرتبہ میں داخل ہوں جس کے افراد یکے بعد دیگرے سلطنت کا انتظام کریں۔ اس درجے میں داخل ہونے کے بعد وہ باقی تمام عمر پوری طرح کاروبار سلطنت میں وقف کر دیں۔ ایسے لوگ ذاتی ملکیت اور اہل وعیال کے بارے سبکدوش ہوں کیونکہ یہ اغراض مملکت کی وحدت کے دائمی دشمن ہیں۔

نظریہ ادب وفن

افلاطون کے زمانے میں مذہب اور فن لطیف کا بہت گہرا ربط تھا افلاطون کا اپنا مذہب فلسفیانہ توحید ہے جس کے اندر خدا اور خیر کا تصور مترادف ہے اور ربوبیت کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ ہے کہ عالم عقل کی پیداوار ہے اور نیکی اور علم خدا کی عبادت ہے۔ خاص خدائے مطلق کے علاوہ وہ تصورات کو سرمدی دیوتا اور کائنات اور ستاروں کو مرئی دیوتا قرار دیتا ہے۔ وہ روایتی دیو مالا کے دیوتاؤں کو محض تخیل کی پیداوار سمجھتا ہے اور ان کی طرف منسوب بد اخلاقیوں کو دیوتاؤں کے لیے ذلت سمجھتا ہے۔ بایں ہمہ وہ یونانی مذہب کو مملکت کا مذہب بنانا اور دیوتاؤں کے افسانوں کو تعلیم کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے مضر حصوں کو نکال دیا جائے۔ وہ قومی مذہب کو منسوخ کرنے کی بجائے اس کی اصلاح کا طالب ہے۔

سقراط کی طرح وہ حسن کو خیر کے ماتحت اور فن لطیف کو اشیاء کی حسی نمو کی نقل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کامیڈی ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے ادنیٰ جذبات کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور سیرت کی سادگی اور سچائی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کے خیال میں کسی بلند مقام پر پہنچنے کے لیے فن لطیف کے لیے ضروری ہے کہ وہ فلسفے کے ماتحت ہو کر چلے اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنے۔ اس کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ نیکی کی عمدگی اور بدی کی نحوست پر زور دے۔ تمام فن لطیف، خصوصاً شاعری اور موسیقی پر

اسی اصول سے نگرانی ہونی چاہیے۔

افلاطون اپنی مجوزہ مملکت سے نہ صرف دیوتاؤں اور مشاہیر کی نسبت قصوں کو خارج کرنا بلکہ تمام ایسی موسیقی کو بھی رد کر دیتا ہے جس میں بہت زیادہ بے اعتدالی اور زنانہ پن پایا جائے۔اس کے ساتھ ہی نقلی شاعری کو بھی دھتکار دیتا ہے۔

افلاطون ایک عظیم ادیب فلاسفر تھا۔اس کی ابتدائی تحریر بھی فلسفے کے ساتھ ساتھ بہترین ادب کا نمونہ ہے اور اس نے اپنی ادبی صلاحیت کو فلسفے اور اخلاقیات کے فروغ کے لیے استعمال کیا ہے۔افلاطون کے نزدیک ادب برائے زندگی اور جمالیات مکمل طور پر اخلاقیات اور فلسفہ کے ماتحت ہے۔اسی لیے خیالی ریاست کے تعلیمی نصاب میں صرف ایسی شاعری کے مطالعہ کی اجازت دی گئی جس میں نیکی، انصاف اور بہادری کے جذبات کو فروغ حاصل ہو۔افلاطون کے خیال میں اصل ادب وہ ہے جس میں اخلاقیات اور سنجیدگی کے پہلو نمایاں ہوں اور جس کا مقصد افراد کے اذہان کی اخلاقی اور عقلی نشوونما ہے۔

افلاطون کے خیال میں ایک فنکار یا ادیب اپنے فن یا ادب کو عقلی استدلال کے تحت تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ ایک وجدانی کیفیت میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ادب میں کہیں کہیں عقلی استدلال کی جھلک موجود ہوتی ہے لیکن ادب کا زیادہ تر حصہ وجدانی کیفیت کی پیداوار ہوتا ہے۔ان کے خیال میں موسیقی، شعر اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوان کی تعلیم کا جزو نہیں بنانا چاہیے بلکہ صرف ان طرزوں کو اپنانا چاہیے جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔سچا آرٹ ہی اچھا آرٹ ہے۔آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر اور ترجمانی کا نام ہے اس لیے اسے بھی اس خیر مطلق کا پرتو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہے۔آرٹ کو دراصل اپنا حقیقی مقصد پورا کرنا چاہیے۔

افلاطون شاعری، مصوری اور موسیقی کے بارے میں ناپسندیدگی کا برملا اظہار

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "میرے مثالی معاشرہ میں اس قماش کی بد آموزیوں کی گنجائش نہیں ہے"۔ افلاطون نے غالباً شاعری کو اس لیے بھی قابل گردن زنی قرار دیا کہ شاعر دیوتاؤں کے متعلق ناشائستہ باتیں کہتے تھے۔ اس کے خیال میں شاعری اور فنون لطیفہ جذبات برانگیختہ کر سکتے ہیں جس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا تھا لہٰذا اس فنون لطیفہ کو مثالی مملکت میں پہنچنے کا سرے سے موقع ہی نہ دیا جائے۔

افلاطون کے نزدیک دنیا عالم مثالی کا عکس ہے چونکہ فنون لطیفہ اور شعر طبعی دنیا کی نقل ہے۔ اس لیے یہ نقل کی نقل ہیں اور اصلیت سے بہت زیادہ ہٹے ہونے کے سبب اعتنا کے قابل نہیں۔ اس ضمن میں وہ الجمہوریہ کی دسویں کتاب میں کہتا ہے کہ ابتدائے شباب میں میرے دل میں ہومر کی بڑی عظمت اور محبت تھی اس لیے کہ المیہ نگاروں کی اس ساری کی ساری دلفریب جماعت کا استاد اور سردار یہی شخص ہے لیکن صداقت سے زیادہ تو کسی شخص کی عزت نہیں ہو سکتی۔

افلاطون کے نزدیک شاعر اس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اپنے موضوع کا علم نہ ہو اور جو یہ علم نہ رکھتا ہو وہ کبھی شاعر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ کہتے وقت کہ یہ تمام المیہ نگار اور ان کا سردار ہومر تمام علوم و فنون سے واقف تھے اور وہ نیکی بدی اور ایسی چیزوں کا مکمل علم رکھتے تھے تو ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں یہاں بھی نظر کا فریب تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو بھی نقالوں سے سابقہ پڑا ہو اور یہ بھی ان کے فریب میں آگئے ہوں۔ لوگوں نے جب ان کی تصنیفیں دیکھیں تو شاید یہ یاد نہیں رکھا کہ یہ تو محض نقلیں ہیں اور پھر صداقت سے تین درجے دوری پر ان کا بنانا بھی آسانی سے ممکن ہے کیونکہ یہ صرف ظاہری شکلیں ہیں حقیقت نہیں ہیں۔ حقیقی صناع جسے علم ہے وہ بجائے نقل کے اصل میں دلچسپی لے گا۔ اور مدحیہ قصائد کا مصنف ہونے کی بجائے ان کا موضوع بننا زیادہ پسند کرے گا۔

افلاطون کہتا ہے کہ اگر ہم ہومر سے یہ پوچھیں کہ اگر آپ نقال نہیں ہیں تو

وہ کونسی ریاست ہے جس پر آپ کی مدد سے بہتر حکومت قائم ہوئی ہو۔ لسی ڈیمون کا اچھا نظام ہے لیکن کون ہے جو کہتا ہے کہ اس نے ان کے لیے اچھے قانون نافذ کیے ہیں اور انہیں کچھ فائدہ پہنچایا ہو۔ کیا زندگی میں اس کے ایسے دوست تھے جو اس کی محبت کے دلدادہ ہوں اور جنہوں نے آنے والی نسلوں تک اس کا طریق زندگی اپنایا ہو۔ مثلاً ایسا حلقہ جیسا کہ فیثا غورث نے قائم کیا تھا کہ لوگ اس کے عرفان کے باعث اسے محبوب رکھتے تھے اور آج کے دن تک اس کے ماننے والے اس سلسلے سے پہچانے جاتے ہیں جو اس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا" تو جواب نفی میں ہوگا۔

افلاطون کے خیال میں اگر ہومر واقعی لوگوں کو سدھارنے اور سکھانے کا اہل ہوتا یعنی بجائے نقال ہونے کے اس کے پاس علم ہوتا تو اس کے بہت سے معتقد اور پیرو ہوتے جو اس کی عزت اور اس سے محبت کرتے۔ سارے کے سارے شاعر ہومر سے لے کر اب تک محض نقال ہیں یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے۔

شاعر کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بناڈالتا ہے حالانکہ وہ اس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لیے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح شاعر اپنے لفظوں اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لیے کافی ہو۔ دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے لفظوں پر فیصلہ کر لیتے ہیں جب یہ شاعر وزن اور بحر کے ساتھ کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت دلنشین انداز میں انہیں بیان کرتا ہے۔ وہ اس لیے کہ نغمہ اور بحر میں قدرتاً شیریں اثر ہے۔ اگر ان شاعروں کے حصوں کو اس رنگ آمیزی سے مبرا کر دیجیے جو موسیقی سے ان پر چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدھی سادی نثر میں انہیں بیان کیجیے تو ان کی پھسپھسی شکل نکل آتی ہے ان کی مثال ان چہروں کی سی

ہوتی ہے جو کبھی بھی حسین نہ تھا بلکہ ان پر لوپر کی چمک دمک تھی جو ان پر سے اتر گئی ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ تین فن ایسے ہیں جن کا ہر چیز سے واسطہ ہے ایک وہ جو اسے استعمال کرتا ہے دوسرا وہ جو بناتا ہے اور تیسرا وہ جو اسکی نقل کرتا ہے اور ہر جان دار اور بے جان چیز کی تیز ہر انسانی عمل کی خوبی حسن، صداقت اس استعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کے لیے قدرت یا صناع نے انہیں مقصود کیا ہے۔ چنانچہ ان کے استعمال کرنے والے کو ہی ان کا سب سے زیادہ تجربہ ہونا چاہیے اور یہی بنانے والے کو بتا بھی سکتا ہے کہ استعمال کے وقت کون کون سی اچھی یا بری صفتیں اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بانسری جانے والا ہی بنانے والے کو بتا سکتا ہے کہ اس کی کونسی بانسری جانے میں اچھی ہے اور اسے کس طرح بانسری بنانی چاہیے اور بنانے والے کا فرض ہے کہ اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے۔ اس طرح جن چیزوں کی نقالی کی جاتی ہے ان کے متعلق نقال کو کوئی قابل ذکر علم نہیں ہوتا نقالی بس ایک طرح کا کھیل ہے یا تفریح اور یہ سارے کے سارے المیہ نگار شاعر چاہے ایمبی میں لکھتے ہوں۔ چاہے رزمیہ میں بدرجہ اولی نقال ہوتے ہیں اور نقالی کو اس چیز سے واسطہ ہے جو حقیقت سے تین درجے دوری پر ہوتی ہیں۔

افلاطون کے خیال میں نقالی کا فن ایک نیچ ذات ہے جو نیچ ذات سے ہی بیاہ کرتا ہے لہٰذا اولاد بھی نیچ ذات ہی ہوتی ہے۔ نقال شاعر جس کا مقصد قبول عام ہے نہ تو قدرتاً اس غرض کے لیے خلق ہوا اور نہ اس کے ہنر کی غائیت ہی یہ ہے کہ روح کے عقلی اصول کو خوش کرے یا اور کسی طرح اس پر اثر ڈالے بلکہ یہ تو ترجیح دے گا جذباتی اور متلون طبیعت کو کہ اس کی نقل اتارنی آسان ہے۔ چونکہ شاعری کی حقیقت کے ذریعے حق تک پہنچنے کی کوئی خاص توقع نہیں کی جا سکتی لہٰذا جو بھی اسے سنے اور اپنے اندر والے شہر کی حفاظت کا کھٹکا بھی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ہمارے لفظوں کو اپنا آئین بنائے اور اس کے بھکاوے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

نظام جزا و سزا

افلاطون نے الجمہوریہ کے دسویں باب میں جزا و سزا کے نظام، روحوں کا دوبارہ انسانی یا حیوانی قالب اختیار کرنے اور عالم ناسوت سے واپسی کے بارہ میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے من و عن پیش ہے۔

"ارمینس کا بیٹا ایر کا جو پیدائشی پامفلیا کا رہنے والا تھا۔ لڑائی میں مارا گیا اور دس دن بعد جب لوگوں نے لاشیں اٹھائیں تو باقی تمام جسم تو سڑ چکے تھے لیکن اس کے جسم پر کوئی اثر نہ تھا، چنانچہ اس کی نعش کو دفن کرنے کے لیے گھر لے گئے۔ بارھویں دن لاش چتا پر رکھی تو یہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور دوسرے عالم میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ لوگوں کو سنایا۔

اس نے کہا کہ جب میری روح نے جسم کو چھوڑا تو میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ سفر پر چل پڑا چلتے چلتے ہم ایک مخفی مقام پر پہنچے جہاں زمین دوز دو دروازے تھے۔ یہ دونوں دروازے قریب قریب تھے اور ان کے مقابل اوپر آسمان میں بھی دو دروازے تھے۔ درمیانی فضا میں حاکم اجلاس کر رہے تھے۔ جب عادل انسانوں کا معاملہ فیصل ہو جاتا اور فیصلہ ان کے سامنے باندھ دیا جاتا تو انھیں حکم ملتا تھا کہ آسمانی راستے سے سیدھے ہاتھ کی طرف چڑھ جاؤ اسی طرح ناانصافیوں کو الٹے ہاتھ کی طرف نیچے اترنے کا حکم ہوتا تھا ان کے اعمال کی نشانیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں لیکن (بجائے سامنے کے) پشت

پر آویزاں ۔ میں جب قریب گیا تو مجھ سے کہا گیا کہ تو وہ پیامبر ہے جو اس عالم کی خبر انسانوں تک لے جائے گا اور مجھے حکم ہوا کہ یہاں جو کچھ دیکھنے سننے کی باتیں ہیں سب دیکھ سن لو۔ میں نے جو نظر کی تو دیکھا کہ جب ان کا فیصلہ سنا دیا جاتا تھا تو زمین اور آسمان کے ایک دروازے سے تو روحیں رخصت ہو رہی تھیں اور دوسرے دونوں دروازوں سے روحیں کچھ تو گرد آلود اور سفر سے ماندہ زمین کے اندر سے اوپر آتیں اور کچھ نہایت صاف جگ مگ آسمان کے نیچے اترتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب کی سب کسی لمبے سفر سے ابھی ابھی آرہی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی سبزہ زار پر جاتیں اور وہاں جاکر یوں پڑاؤ ہوتا گویا کوئی تہوار ہے۔ جو روحیں ایک دوسرے سے واقف تھیں وہ گلے ملتیں اور خوب باتیں کرتیں۔ زمین سے آنے والی روحیں نہایت اشتیاق سے اوپر کا حال دریافت کرتیں اور آسمان سے آنے والی نیچے کا حال، سب ایک دوسرے سے راستے کے واقعات بیان کرتیں' نیچے سے آنے والی روحیں ان پر جو کچھ زیر زمین سفر میں گذری تھی (اور یہ سفر ہزار سال کا تھا) اس کی یاد پر روتیں' اوپر سے آنے والیاں آسمانی مسرتوں اور حسن کے ناقابل تصور مظاہر بیان کرتیں۔

سارا قصہ "گلاکن" تو بڑا وقت لے گا' خلاصہ یہ ہے کہ اس نے بیان کیا کہ انھوں نے کسی کے ساتھ جو برائی کی تھی اس کا دس گناہ عذاب بھگتنا پڑا یعنی اگر سو سال میں ایک دفعہ برائی کی تھی (اور انسانی عمر کا یہی اندازہ کیا گیا ہے) تو سزا دس گنا ایک ہزار سال میں پوری ہوئی۔ مثلاً اگر کوئی بہت سی موتوں کا باعث ہوا ہو اگر کسی نے شہروں یا لشکروں کو غلام بنایا' یا انھیں دغا دیا ہو یا کسی اور بد کرداری کا مرتکب ہوا ہو تو ان تمام گناہوں کے لیے اور ایک ایک کر کے دس گنا سزا ملتی ہے۔ اسی طرح احسان 'عدل اور تقویٰ کا انعام بھی اسی نسبت سے ملتا ہے۔

اس کے دہرانے کی تو چنداں ضرورت نہیں جو اس نے ان چھوٹے بچوں کی بابت کہا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ دیوتاؤں اور والدین کے ساتھ سعادت مندی یا غیر

سعادت مندی کی بلت تیز قاتلوں کے متعلق اس نے اور بہت بڑی بڑی جزاؤں سزاؤں کا بیان کیا۔ یہ کہتا تھا کہ جب ایک روح نے دوسری سے دریافت کیا کہ "اردیائیس اعظم کہاں ہے" دوسری روح نے جواب دیا کہ "وہ یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی آئے گا۔ یہ اردیائیس ایر کے زمانے سے کوئی ہزار سال پہلے تھا' یہ پمفیلیا کے کسی شہر کا مستبد حاکم تھا' اپنے بوڑھے باپ اور بڑے بھائی کو اس نے قتل کر ڈالا تھا اور کہتے ہیں کہ ایسے ہی اور بہت سے نفرت انگیز گناہوں کا مرتکب تھا اس وقت میں وہاں موجود تھا اور ان ہیبت ناک مناظر کا میں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔

ہم غار کے دہانے پر تھے اور چونکہ اپنا سارا تجربہ حاصل کر چکے تھے اس لیے اب اوپر چڑھنے والے ہی تھے کہ یکایک اردیائیس اور کئی لوگ نمودار ہوئے ان میں سے اکثر جابر مستبد تھے اور ان ظالموں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جو دنیا میں بڑے بڑے مجرم رہ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بس اسی عالم بالا کو واپس جاتے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ دہانے میں یہ داخل ہو سکیں' جب ان میں سے کوئی جس کی کافی سزا نہ ہو چکی تھی چڑھنے کی کوشش کرتا اس سے ایک سخت چیخ نکلتی۔ اس پر کچھ مہیب آتشیں رو انسان جو پاس کھڑے اس آواز کو سنتے تھے انھیں پکڑ کر ساتھ لے جاتے اردیائیس اور بعض دوسروں کو تو انھوں نے سر پیر ہاتھ سب باندھ کر نیچے پھینک دیا' پھر راستے بھر انھیں خوب گھسیٹا انھیں کانٹوں پر اون کی طرح دھنکا اور رلو چلتے برابر کہتے جاتے تھے کہ انھوں نے یہ یہ جرم کیے تھے اور ہم پھر انھیں جہنم میں ڈالنے کے لیے جاتے ہیں۔ ہم نے جو بہت سی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان میں کوئی مصیبت اس گھڑی سے کٹھن نہ تھی جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کہیں ہمارے لیے بھی یہ آواز نہ نکلے' لیکن جب خاموشی رہی تو ہم ایک ایک کر کے خوشی خوشی اوپر چڑھ آئے بقول ایر یہ تو تھے وہاں کے بدلے اور سزائیں اور پھر انعام اور برکتیں بھی ایسی ہی تھیں۔

یہ روحیں سات دن تک اسی سبزہ زار میں ٹھہری رہیں' آٹھویں دن انھیں حکم ملا کہ پھر سفر شروع کریں۔ چوتھے دن یہ ایک جگہ پہنچیں جہاں سے روشنی کی کرن دکھائی

دیتی تھی سیدھی جیسے ستون' آسمان زمین کے آرپار' رنگ میں دھنک سے مشابہ' لیکن پاکیزہ اور روشن تر۔ ایک دن بھر اور چل کر اس جگہ پہنچ گئے یہاں اس روشنی میں انہوں نے آسمانی زنجیروں کے سرے دیکھے جو اوپر سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ روشنی آسمان کی پیٹی ہے اور سارے کرہ عالم کو اس طرح یکجا کیے ہوئے ہے جیسے جہاز کی کڑیاں' زنجیر کے ان سروں پر جبرو لزوم کا تکلا لٹکا ہوا ہے اور اسی پر سارے چکر ہوتے ہیں۔ اس تکلے کی جھڑ اور قلابے فولاد کے ہیں اور پھرکی کچھ فولاد کی اور کچھ اور دوسرے مسالے کی۔ پھرکی کی شکل وہی ہے جیسی یہاں دنیا میں عام رواج ہے۔

ایر نے اس کا جو بیان دیا اس سے پتہ چلتا تھا کہ ایک بڑی سے پھرکی ہے جسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اس کے اندر اس سے ایک ذرا چھوٹی پھرکی بٹھادی ہے' اس کے اندر ایک اور' اسی طرح چار اور الغرض کل آٹھ پھرکیاں ہیں۔ ایسے جیسے ایک برتن کے اندر دوسرا برتن رکھ دیا ہو۔ اوپر کی طرف تو ان پھرکیوں کے سرے دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے سب کے سب مل کر ایک پھرکی بناتے ہیں۔ اس کے اندر سے تکلا گذرتا ہے اور آٹھویں پھرکی کو بیچ میں سے چھیدتا ہے۔ پہلی پھرکی جو سب سے باہر ہے اس کا کنارہ بھی سب سے بڑا ہے' دوسروں کے کنارے اس ترتیب سے چھوٹے ہیں' بڑائی میں چھٹی کا نمبر پہلی کے بعد ہے' چھٹی کے بعد چوتھی کا' اس کے بعد آٹھویں' پانچواں نمبر ساتویں کا اور چھٹا نمبر پانچویں کا ہے' تیسری ساتویں نمبر پر ہے اور دوسری سب سے خر یعنی آٹھویں نمبر پر۔ سب سے بڑی پھرکی (یعنی ثوابت) نہایت مرصع ہے۔ ساتویں سورج) روشن ترین ہے۔ آٹھویں (چاند) ساتویں کی روشنی کے عکس سے رنگ حاصل رتی ہے دوسری اور پانچویں (زحل اور عطارد) رنگ میں ہیں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں ہاں اوروں کے مقابلے میں ذرا پیلے ہیں' تیسرے کی (زہرہ) روشنی سب میں سپید ہے چوتھی (مریخ) کچھ سرخی مائل اور چھٹی (مشتری) سپیدہ میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اچھا سارے تکلے کی تو ایک ہی حرکت ہے لیکن جب یہ کل ایک طرف حرکت کرتا ہے' تو اندر

کے سات چکر سمت مخالفت میں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں' ان میں آٹھواں سب سے تیز چلتا ہے' اس کے بعد تیزی کے اعتبار سے ساتویں' چھٹے اور پانچویں کا نمبر ہے اور سب کے سب ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں' پھر حرکت قہقری کے اس قانون کے ماتحت تیزی کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر چوتھا چکر آتا تھا' چوتھے نمبر پر تیسرا اور پانچویں پر دوسرا' تکلا جبر و لزوم کے گھٹنوں پر گھومتا ہے' ہر چکر کے اوپر ایک مغنیہ ہے جو ساتھ ساتھ چکر کھاتی اور ایک ہی انداز سے ایک سر گائے جاتی ہے۔ آٹھوں مل کر ایک متناسب نغمہ مرتب کر لیتی ہیں' ان کے چاروں طرف برابر برابر فصل سے تین کا ایک اور گروہ ہے' یہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھی ہیں۔ یہ ہیں جبر و لزوم کی بیٹیاں' قضاؤ قدر کی دیویاں۔ یہ سفید لباس زیب تن کیے ہیں' سر پر ہر ایک کے ایک ایک ہار ہے۔ لاچے سس' کلو تھو اور اتروپاس ان کے نام ہیں۔ یہ اپنی آواز سے مغنیہ کی موسیقی کا ساتھ دیتی ہیں۔ لاچے سس ماضی کا ترانہ گاتی ہے' کلو تھو حال کا اور اتروپوس مستقبل کا۔ کلو تھو اپنے سیدھے ہاتھ سے کبھی کبھی تکلے کے باہر والے چکر کو ذرا گھما دیتی ہے اتروپوس الٹے ہاتھ سے اندرونی چکروں کو چھو کر ان کی رفتار سادھتی ہے' اور لاچے سس باری باری دونوں کو چھوتی رہتی ہے کبھی ایک ہاتھ سے' کبھی دوسرے ہاتھ سے۔

ایر اور دوسری روحیں جب یہاں پہنچیں تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے لاچے سس کے پاس جائیں لیکن اس سے پہلے ایک پیغمبر نمودار ہوا جس نے ان سب کو ایک نظام سے مرتب کیا' پھر لاچے سس کے قدموں پر سے قسمتیں اور زندگی کے مختلف نمونے لے کر یہ ایک اونچے منبر پر چڑھ گیا اور انھیں یوں مخاطب کیا۔ سنو! جبر و لزوم کی بیٹی لاچے سس کا پیغام سنو! فانی روحو! زندگی اور موت کا ایک اور دور دیکھو۔ تمھارا فرشتہ تمھیں دیا نہ جائے گا بلکہ تم خود اپنے اپنے فرشتے کا انتخاب کرو گے۔ جو پہلی چٹھی اٹھائے گا اسی کو پہلا حق انتخاب ہو گا' پھر یہ جو زندگی چنے گا وہی اس کی قسمت ہو جائے گی۔ نیکی آزاد ہے اور بے آقا' جو اس کی جتنی عزت یا جتنی ذلت کرے گا اتنی ہی زیادہ یا کم

اسے ملے گی ذمہ داری انتخاب کرنے والے پر ہے اور خدا بری الذمہ۔

ترجمان نے یہ کہہ کر بلا امتیاز ان میں چھٹیاں پھیلا دیں' جو چھٹی جس کے قریب تھی وہ اس نے اٹھالی' اس طرح سوائے ایر کے سب نے اٹھائیں (اسے اجازت نہ تھی) اور ہر ایک نے دیکھا کہ اسے کونسا عدد ملا ہے۔ اب ترجمان نے ان کے سامنے زمین پر زندگی کے نمونے رکھ دیے جتنی روحیں وہاں موجود تھیں ان سے کہیں زیادہ زندگیوں کے نمونے تھے اور پھر ہر طرح کے جانوروں کی زندگیاں تھیں' اور ہر حالت کے انسانوں کی' ظالم استبدادی زندگیاں بھی تھیں' بعض ایسی کہ ظالم کی عمر بھر بلکہ اس سے زیادہ باقی رہیں' بعض ایسی کہ بیچ ہی میں منقطع ہو جائیں اور خاتمہ افلاس' دریوزہ گری اور جلاوطنی میں ہو۔ پھر سورماؤں کی زندگیاں تھیں' ایسوں کی جو اپنی شکل و صورت اور حسن نیز طاقت اور کھیلوں میں کامیابی کے لیے مشہور تھے' بعض ایسوں کی جو حسب و نسب اور اجداد کی خوبیوں کے باعث ممتاز تھے' کچھ زندگیاں ایسوں کی بھی تھیں جو ان سے بالکل برعکس صفتوں کے باعث بدنام تھیں۔ عورتوں کی زندگیاں بھی تھیں' لیکن ان روحوں کی سیرت متعین نہ تھی کیونکہ جب روح نئی زندگی اختیار کرتی ہے تو لازم ہے وہ بالکل بدل جائے لیکن اور ساری صفتیں موجود تھیں سب کی سب ایک دوسرے میں گڈمڈ دولت اور افلاس' صحت اور مرض کے عناصر کی بھی آمیزش تھی' علاوہ بریں دوسری ذلیل کیفیتیں بھی موجود تھیں۔

میرے عزیز گلاکن! یہاں ہے حیات انسانی کا خطرہ عظیم اور یہیں حد درجہ احتیاط درکار ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اور تمام علوم کو بالائے طاق رکھ کر بس اس ایک چیز کی طلب و جستجو میں لگ جائے۔ کیا عجب کہ ہم نیک و بد میں تمیز کرنا سیکھ جائیں یا ہمیں کوئی شخص مل جائے جو یہ چیز سکھا سکے تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملے ہم بہتر زندگی منتخب کر سکیں۔ اس کے اسباب پر دھیان رکھنا چاہیے کہ یہ جو چیزیں ہم نے اوپر بیان کیں ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اور پھر سب مل کر نیکی پر کیا اثر ڈالتی ہیں' اسے جاننا ہو

گا کہ کسی خاص روح میں اگر صورت کے حسن کو دولت سے یا افلاس سے ملا دیں تو اس کا کیا اثر ہوگا اچھے یا برے حسب نسب' خانگی یا سرکاری عہدے' طاقت یا کمزوری' چالاکی اور کند ذہنی' روح کی ساری فطری صفتیں اور ان کے باہمی عمل' ان سب کے اچھے برے نتیجوں سے اسے آگاہ ہونا چاہیے۔ تب کہیں یہ روح کی ماہیت کو دیکھ کر اور ان تمام باتوں پر نظر کر کے بتلا سکے گا کہ کون سی زندگی بہتر ہے اور کون سی نہیں اور اس طرح انتخاب کرے گا کہ جو زندگی روح کو زیادہ ناانصاف بنائے وہ بری اور جو اسے زیادہ منصف بنائے وہ اچھی۔ باقی دوسری باتوں کو یہ بالکل نظر انداز کر دے گا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زندگی اور موت دونوں میں یہی بہتر انتخاب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے ساتھ عالم زیریں میں بھی حق اور صداقت پر ایسا ایمان ساتھ لے جائے جو کبھی نہ ڈگمگائے' تاکہ وہاں بھی دولت کی آرزو اور باطل کے فریب اس کی نگاہ کو خیرہ نہ کر سکیں' اور یہ نہ ہو کہ ظلم اور استبداد اور دوسری بداطواری کی زندگیوں کو دیکھ کر یہ دوسروں کو ناقابل تلافی اذیت پہنچائے اور خود اپنی ذات کو اس سے بھی بڑی مضرت دینے کا باعث بنے۔ اسے جاننا چاہیے کہ اسی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے تمام مراحل میں بھی جہاں تک بن پڑے دونوں طرف کے انتہائی سروں کو چھوڑ کر درمیانی راہ کس طرح اپنے لیے منتخب کرے کہ یہی سعادت و شادمانی کی راہ ہے۔

دوسرے عالم کے اس خبر دینے والے نے پھر بیان کیا کہ اس موقع پر اس پیغمبر نے یہ اور کہا "بالکل آخر میں آنے والے کے لیے بھی اگر وہ سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے اور محنت سے زندگی گزارے تو ایک مسرت بخش اور خاصی پسندیدہ زندگی مقرر ہے جو سب سے پہلے انتخاب کرتا ہے یہ نہ ہو کہ وہ بے پروا ہو جائے اور جو سب سے آخر میں ہے اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ جب کہہ چکا تو جسے سب سے پہلا حق انتخاب ملا تھا وہ آگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے اس نے سب سے بڑے ظلم اور استبداد کو اپنے لیے چن لیا۔ اس کا دماغ چونکہ حماقت اور حرص سے تاریک ہو چکا تھا اس نے چناؤ سے پہلے سارے

معاملے پر غور نہیں کیا اور پہلی نظر میں یہ بات اسے نہ سجھائی دی کہ مجملہ دیگر برائیوں کے اس کی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ اپنی اولاد کو خود نگل جائے گا۔ لیکن جب ذرا غور کرنے کا موقع ملا اور اس نے دیکھا کہ اس کی قسمت میں کیا کیا آیا تو لگا چھاتی پیٹنے اور اپنے انتخاب پر رونے دھونے اور پیغمبر کے سابقہ اعلان کو بھول گیا اور بجائے اس کے کہ اپنی بدنصیبی کا الزام خود اپنے آپ کو دے لگا بخت و اتفاق اور دیوتاؤں کو ذمہ دار ٹھہرانے۔ غرض ہر ایک ملزم تھا بس یہی ایک بے قصور۔

سنو! یہ ان لوگوں میں سے تھا جو آسمان سے آئے تھے' سابقہ زندگی میں یہ ایک نہایت عمدہ منتظم ریاست رہ چکا تھا' لیکن اس کی نیکی خالی عادت پر مبنی تھی' اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ یہی حال اوروں کا تھا جن پر اسی قسم کی افتاد پڑی یعنی ان میں سے اکثر آسمان سے آئے تھے' امتحان و آزمائش سے ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی ہاں زمین سے آنے والے چونکہ تکلیفیں جھیل چکے تھے' اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھاتے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے انہیں انتخاب کرنے کی جلدی نہ تھی۔ کچھ تو اس ناتجربہ کاری کے باعث کچھ اس سبب سے کہ چٹھیوں کا نکلنا کچھ اتفاق پر منحصر تھا بہت سی روحوں نے بری کے بدلے اچھی اور بہتوں نے اچھی کے بجائے بری قسمت پائی۔

ہمارے قاصد کا بیان ہے کہ اگر اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے آپ کو تمام تر سچے فلسفے کے لیے وقف کر دے اور پھر چٹھی نکلنے کے معاملے میں بھی معمولی سا خوش قسمت ہو تو وہ یہاں خوش رہے اور دوسری زندگی میں اس کا سفر اور پھر وہاں سے دوبارہ ایسی دشوار گزار اور زیر زندگی راستوں سے نہ ہو بلکہ نہایت ہموار آسمانی راہوں سے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ منظر بھی نہایت حیرت انگیز اور عجیب تھا ایک ہنسی تھی اور ایک دکھ۔ اکثر روحوں کا انتخاب پچھلی زندگی کے تجربوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اس نے یہاں وہ روح دیکھی جو کبھی آرفیس تھی اسے چونکہ عورتوں نے قتل کیا تھا اس لیے یہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے کے خیال سے بھی نفرت کرتا تھا اور عورتوں کی ساری نسل سے اس

عداوت کے باعث اس نے ہنس کی زندگی انتخاب کی۔ اس نے ھائرس کی روح کو بھی بلبل کی زندگی منتخب کرتے دیکھا۔ برخلاف اس کے چڑیاں مثلاً ہنس اور دوسرے گانے والے پرندے انسان بننا چاہتے تھے۔ جس روح کو بیسواں عدد ملا تھا اس نے شیر کی زندگی پسند کی' یہ اجاکس بن تلامون کی روح تھی جو اس لیے انسان بننا چاہتی تھی کہ ہتھیاروں کے معاملے میں اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی۔ اس کے بعد اگممنان کی باری تھی۔ اس نے عقاب کی زندگی اختیار کی کیونکہ اجاکس کی طرح اپنی مصیبتوں کا خیال کر کے یہ بھی انسانی فطرت سے نفرت کرتا تھا۔ بیچ میں اتلانتا کا نمبر آیا اس نے ایک کھلاڑی پہلوان کی شہرت دیکھی تو اس لالچ کا مقابلہ نہ کر سکی اس کے بعد پنوپیس کے بیٹے اپیس نے ایک مکار حرافہ عورت کی زندگی اختیار کی۔' آخر میں انتخاب کرنے والوں میں کہیں دور مسخرہ تھرسیٹیس بھی تھا' اس نے بندر کی شکل قبول کی۔ اب اوڈیسیس کی روح آئی کہ اس کا نمبر آخری تھا اور اسے ابھی اپنے لیے انتخاب کرنا تھا۔ پچھلی مشقتوں کی یاد نے اس کے حوصلے کو پست کر دیا تھا' یہ بڑی دیر تک ادھر ادھر ایک خانگی آدمی کی زندگی ڈھونڈتا پھرا جسے کوئی غم اور فکر نہ ہو۔ اس کے ملنے میں ذرا دشواری ہوئی' یہ کہیں ایک طرف پڑی تھی اور سبھوں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا تھا۔ یہ جو اس زندگی کو دیکھ پایا تو بولا کہ اگر مجھے بجائے آخر کی جگہ انتخاب کا پہلا حق ملتا تو بھی میں اسی زندگی کو منتخب کرتا' اور اسے پا کر وہ واقعی بڑا خوش تھا۔

یہی نہیں کہ آدمی ہی جانوروں کی زندگیاں اختیار کرتے تھے' میں یہ بھی ضرور کہہ دوں کہ جنگلی اور پالتو جانور آپس میں بھی اپنی زندگیاں بدل رہے تھے اور اپنی طبیعت کی مناسبت سے انسانی زندگیاں بھی اختیار کرتے تھے' مثلاً اچھے نرم مزاج بھلے مانسوں کی زندگی اور برے وحشیوں کی' غرض طرح طرح اور ہر ممکن طریقے سے۔ اب جب سب روحیں اپنی اپنی زندگی منتخب کر چکیں انتخاب کی ترتیب سے لاچے سس کے سامنے پہنچیں اس نے ان کے ساتھ وہ فرشتہ کر دیا جو ہر ایک نے منتخب کیا تھا

تا کہ وہ ان کی زندگی کا نگہبان رہے اور ان کے انتخاب کو پورا کرے۔ یہ فرشتہ پہلے تو انہیں کلوتھو کے روبرو لے گیا اور یہ اپنے ہاتھ سے جس تکلے کو چلا رہی تھی اس میں رکھ کر انھیں چکر لیا اور اس طرح گویا ہر ایک کی قسمت کی تصدیق ہو گئی پھر خود تکلے کو چھو کر یہ انہیں اتروپوس کے پاس لے گیا جو (قسمت کے) ڈورے کات رہی تھی تا کہ یہ ناقابل تغیر ہو جائے۔ یہاں سے یہ بغیر منہ پھیرے جبر و لزوم کے تخت کے تلے سے گزرے' جب سب اس کے نیچے سے نکل گئے تو خود فراموشی کے جلتے تپتے میدان میں پہنچے' یہ ایک چٹیل میدان تھا جس میں نہ درخت کا پتہ تھا نہ سبزے کا نام و نشان۔ شام ہوتے ہوتے دریائے تغافل کے کنارے پڑاؤ کیا۔ اس دریا کا پانی کسی برتن میں نہ سماتا تھا' ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پئیں' جنہیں عقل نے نہیں سنبھالا' وہ ضرورت سے زیادہ پی گئے۔ اس کے پیتے ہی سب کے سب ساری باتیں بھول گئے۔ پھر سب پڑے سوتے تھے کہ آدھی رات کو برق و باد کا طوفان اور زلزلہ شروع ہوا اور جیسے ٹوٹے ہوئے تارے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مختلف راستوں سے اپنی جائے ولادت تک پہنچا دیے گئے۔ ہمارے قاصد کو یہ پانی البتہ نہیں پینے دیا گیا لیکن یہ کیونکر اور کس طرح پھر جسم میں واپس آیا کا خود اسے پتہ نہیں' صبح جو یک بیک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تابوت پر لیٹا ہے۔

اور یوں' میاں گلاکن یہ قصہ باقی رہ گیا فنا نہیں ہوا۔ اب اگر ہم بھی قول کے تابع رہیں تو یہ ہمیں بھی بچا لے اور ہم اطمینان سے اپنی روح کو آلودہ کیے بغیر تغافل کے دریا میں سے گزر جائیں۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس آسمانی راہ پر ثابت قدم رہیں۔ ہمیشہ عدل اور خیر کا تتبع کریں اور یقین رکھیں کہ روح غیر فانی ہے اور ہر طرح کی اچھائی نیز ہر طرح کی برائی برداشت کر سکتی ہے۔ یوں ہم ایک دوسرے کی نظر میں بھی عزیز اور محترم رہیں گے اور دیوتاؤں کی نگاہ میں بھی' جب تک یہاں ہیں تو یہاں اور اس وقت بھی جب انعام لینے کے لیے ہم ان کھیل میں بازی جیتنے والوں کی طرح جائیں گے جو تحفے

وصول کرنے کے لیے چکر لگاتے ہیں۔ اس سے اس زندگی میں بھی ہمارا بھلا ہوگا اور
اس ہزار سالہ سفر میں بھی جسے ہم ابھی بیان کر رہے تھے"۔

نظریات افلاطون ایک نظر میں

- حکومت صرف عالموں کا حق ہے۔
- سیاستدان کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اخلاقی اقدار سے باخبر ہو اور قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے۔
- ریاست کے تینوں طبقے روح کے تینوں طبقوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ نچلا طبقہ نفس امارہ یعنی شکم، فوجی طبقہ نفس لوامہ یعنی دل اور حاکموں کا طبقہ نفس مطمئنہ یعنی دماغ ہے۔
- سرکاری غبن، جنسی جرائم، غداری، دہریت، بدعت اور مقدس چیزوں کی بے حرمتی کی سزا موت ہونی چاہیے۔
- جہیز لینے اور دینے پر پابندی ہونی چاہیے۔
- سونا چاندی رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔
- غلام سے بیگار لینی چاہیے۔
- غیر ملکیوں کو ریاست میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت ہونی چاہیے۔

◎ اچھا آدمی صرف اچھی ریاست پیدا کرتی ہے۔

◎ اجتماعی زندگی میں سچا اصول عقل ہے۔

◎ عدل روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے۔

◎ حکومت اگر فن ہے تو ہر فن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا۔

◎ سچے حکمران کو بے غرض اور محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔

◎ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانشمند، زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔

◎ عدل کل کا جوہر ہے اور تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے۔

◎ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد کا تعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کروائے۔

◎ مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت و جرات سے ریاست کی حفاظت کرے۔

◎ دولت مند گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے مطابق چلائے۔

◎ ارباب علم اور اصحاب عمل فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ہی جاہل اور خود غرض سیاستدانوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

◎ فلسفی ہی نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں۔ ان پر نہ قانون کی پابندی لاگو ہے اور نہ بے جا رسم و رواج کی بندش۔

◎ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے اور اس کی حقیقی اصلاح ذہن کی اصلاح سے ممکن ہے۔

◎ مملکت اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔انسانی ذہن تین اجزاء یعنی اشتہا' حوصلہ اور عقل کا مجموعہ ہے جبکہ مملکت کے تینوں طبقے معاشی طبقہ 'فوجی طبقہ اور حکمران طبقہ اسی ذہنی عکس کی پیداوار ہے۔

◎ مثالی مملکت کے سب سے قریب طرز حکومتTimocracy ہے اور یہ حکومت عقل کی برتری پر قائم ہے۔

◎ مملکت محور کل ہےاور فرد کی فردیت کی ضامن ہے۔

◎ فرد مملکت کا ایک ادنیٰ جزو ہے اور جزو ہونے کے ناطے اس کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ ایک کل کی مکمل تکمیل کے لیے دیگر افراد کے ساتھ مل کر سرگرم عمل رہے۔

◎ مملکت وہ اعلیٰ وبرتر ادارہ ہے جس کی تکمیل کے لیے دوسرے ادارے اور افراد اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔

◎ جمہوریت محض دھوکہ اور فریب ہے۔عام لوگوں کی رائے کو حقیقت یا علم کا درجہ دینا جہالت ہے کیونکہ رائے تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں۔

◎ جمہوریت مستقل کشمکش اور فتنہ وفساد ہے۔

◎ مملکت کے زوال کی پہلی وجہ نام و نمود 'نمائش اور شان و شوکت کی خواہش ہے۔

◎ رعایا کی بھلائی ہی حکمرانوں کی بھلائی ہے۔

◎ ریاست اچھائی کے فروغ اور بہتر عوامی زندگی کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔

◎ انسان نے ریاست اپنی ضروریات کی تکمیل کی خاطر تشکیل دی۔

◎ ریاست فرد کی طرح ایک عضریتی فرد ہے۔

◎ ریاست کا یہ فرض ہے کہ افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق جسمانی اور روحانی'

نشوونما کے لیے بہترین مواقع فراہم کرے۔

◎ کوئی ریاست اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک حکومت ایسے اشخاص کے پاس نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ ریاست کی بہتری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

◎ تعلیم ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے نیک اور بہترین انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔

◎ لفظوں کو براہ راست اشیاء کی ماہیت مشتق سمجھنا بہت مشکوک ہے اور لفظوں کی مدد سے اشیاء کی ماہیت کو سمجھنا بھی ناممکن ہے۔

◎ بعض فنون جھوٹے اور سچے ہوتے ہیں۔اسی طرح لذتیں بھی جھوٹی اور سچی اچھی اور بری ہوتی ہیں۔

◎ خطابت پردازی ناقص اور گمراہ کن فن ہے۔

◎ حقیقی عشق وہی ہے جو فلسفی ہو اور حیات کی دنیا سے بلند ہو کر جی سکے۔

◎ روحانی صعود کے مراحل میں پہلے کسی فرد کی ظاہری خوبصورتی ہے۔پھر اس جسمانی حسن سے جو مجموعی طور پر نسل انسانی کو اوزانی ہوا ہے اور آخر میں روح کے جمال سے عشق کیا جائے۔

◎ عشق دیوتاؤں کی دین ہے جو انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔

◎ آسمانی توفیق شامل نہ ہو تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

◎ لذت اور دانش دونوں لازم و ملزوم ہیں۔البتہ لذت کو دانش کے تابع ہونا چاہیے۔

◎ ہر شے کا آسمانی عین اپنی جگہ لیکن ناسوت میں وہ کثرت کے روپ میں ظاہر

ہونے پر مجبور ہے انسانی ادراک بھی اسی عالم آب و گل تک ہے اور حقائق کی وحید اور تنزیہی صورتوں تک اس کی رسائی بہت بعید ہے۔

- صرف دل و دماغ پر تکیہ کرنے سے علم کا حصول ممکن نہیں۔
- احساس کی حقیقت خود اپنے تک محدود ہے اور خیالات الٹ پھیر ہیں۔
- دنیا ایک الوہی ہستی نے تخلیق کی اور اسی نے دوسری آسمانی ہستیوں دنیا اور ستاروں کی روحوں اور انسانی روح میں ابدی جوہر کو تخلیق کیا ہے۔
- حکمرانی کامل مشکل ترین فنون میں سے ہے لہٰذا حکومت کی باگ ڈور مملکت کے ان لوگوں اور ذہنی اعتبار سے اعلیٰ ترین افراد جن میں وسیع النظری اور معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہو کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے۔
- مسرتوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ہر شخص سے اہلیت صلاحیت اور گنجائش کے مطابق کام لینا ضروری ہے۔
- شہری زندگی زندگی کے حقائق کا مجموعہ اور سچائی سے بھرپور منظم زندگی ہوتی ہے۔
- مثالی شہری میں جسمانی حسن ذہنی بالیدگی حصول علم کی قابلیت و خواہش ذوق جمال برائی سے نفرت ذہنی اختراع اچھائی کی پہچان جسمانی توانائی اور حاضر دماغی جیسی صفات موجود ہونی چاہیئے۔
- پیشہ ور لوگ جسمانی یا نفسانی خواہشات سپاہی ہمت اور بہادری جبکہ فلسفی اور محافظ دانائی کے مظہر ہیں۔
- خدا نے فلسفیوں اور محافظوں کو سونے سے سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے۔ لہٰذا نچلے طبقے پر لازم ہے کہ وہ دونوں برتر طبقوں کی جو

انسانیت کے بہترین عناصر ہیں کی پوری اطاعت کرے۔

- مملکت کا دستور جس قدر گہرا ہوگا مملکت کے شہری اسی نسبت سے سچی خوشی، حقیقی مسرت اور سکون سے دور ہونگے۔
- عدل اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہر شخص کا تعلق اپنی فطری صلاحیت اور استعداد کے مطابق کسی نہ کسی طبقے سے ہو۔
- سیاسی عدل کی اصل غرض ہر طبقے کے تمام افراد کو ان کاموں میں مصروف رکھنا ہے جن کے لیے وہ فطری مناسبت اور صلاحیت کی بنا پر موزوں ہیں۔
- ایک فرد میں وہ تمام خواص چھوٹے پیمانے پر موجود ہوتے ہیں جن کا بڑے پیمانے پر ایک معاشرہ حامل ہوتا ہے۔
- معاشرہ نہ صرف ایک فرد کے پھیلاؤ کا نام ہے بلکہ ایک فرد ریاست کا اختصار بھی ہے۔
- حکمرانوں اور سپاہیوں کے پاس نجی املاک نہیں ہونی چاہیے اور صرف املاک اور کنبہ کے بارے میں اشتراکیت کا نظام مناسب حالات پیدا کر سکتا ہے۔
- عدل ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے۔
- مثالی مملکت وہ ہے جس میں اچھائیوں کو فروغ، انصاف کی تکمیل کائنات کے ہمہ گیر روحانی نظام کے تحت موجودات کی حقیقت جاننے کی جستجو اور نیکی کے حصول کے لیے عملی جدوجہد ہو۔
- انصاف ایک مقصد ہے اور اس کی تکمیل معاشرہ کے لیے فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔

- کسی حقدار کو حق دینا ایک Universal Thought ہے انصاف نہیں۔
- انصاف کا تعلق انسانی روح سے ہے اور وہ ایک داخلی مکمل اور غیر متبدل ہے۔
- حکومت کا قیام اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ اصل مقصد بلاشبہ عوام کا مفاد اور ان کی بہبود اور انہیں بہترین اور اخلاقی زندگی فراہم کرتا ہے۔
- انسانی قدریں اور اخلاق کا تعلق ضمیر سے ہے اور انسانی ضمیر کو جبر واستبداد اور سزا کے ذریعے کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔
- انصاف ایک اندرونی قوت ہے جو انسان کے فطری رجحانات سے منسوب ہے۔
- حکمران کے پاس علم کا ہونا بہت ضروری ہے۔
- انصاف یا عدل یہ ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق فرائض تفویض کیے جائیں اور وہ طبقہ یا افراد ان تفویض کردہ فرائض کو اپنے متعین کردہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے سرانجام دیں، دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہ کرے اور نہ ہی اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرے۔
- اشتہا کا نمائندہ معاشی طبقہ خاندان رکھ سکتا ہے تاکہ اس طبقہ کی عورتیں حکمران اور فوجی طبقے کی دیگر مادی ضروریات کی طرح جنسی خواہشات بھی پوری کر سکیں۔
- مملکت کو ایک خاندان کی طرح ہونا چاہیے۔

- تعلیم ہی ایک ذریعہ ہے جس سے ناقص معاشرے کو نئے سرے سے نئی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔
- تصورات ہی حقیقت ہیں۔
- حقیقی مملکت کی تشکیل ہی انسانی زندگی کا اولین مقصد ہے۔
- ہماری جستجو دنیا کے سب سے اہم مسئلے یعنی نیک اور بد زندگی سے متعلق ہے۔
- دنیا میں سب انسان مساوی اور برابر نہیں ہیں۔
- راست عمل صرف اچھائی کے تصور کے باعث ممکن ہے۔
- ہر شخص میں خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ اچھائی اور برائی کے جانچنے کا علم موجود ہونا چاہیے۔
- تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور اس پر فلسفیانہ ضابطوں کے تحت کنٹرول ضروری ہے۔
- تعلیم روح کی پیدائش اور اس کی نشوونما کا نام ہے۔
- نظام تعلیم مکمل طور پر ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیے۔
- فلسفیوں میں فہم وادراک عقل سلیم اور وجدان موجود ہوتے ہیں ان کا عمل راست عمل ہوتا ہے وہ ہر وقت سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لہذا انہیں حکمران ہونا چاہیے انہیں دنیاوی خواہشات اور اقتصادی مشکلات سے آزاد ہونا چاہیے۔
- اقتدار 50 سے 70 سالہ عمر کے 37 منتخب عوامی نمائندوں کے ہاتھ ہونا چاہیے جن کے ذمہ قانون سازی کے علاوہ سرکاری شعبوں کی نگرانی بھی ہونی

چاہیئے۔

- ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔
- سزاؤں سے مجرم کی نیکی میں اضافہ اور بدی میں کمی ہوتی ہے۔
- انسان مجبور، بے بس اور جرم و سزا کا پابند ہے۔
- شہریوں کا ذریعہ معاش زراعت ہونا چاہیئے شہری کے پاس زرعی زمین کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا سرحد پر ہونا چاہیئے تاکہ شہری مملکت کی حفاظت کر سکیں۔
- دست کاری، صنعت و حرفت اور تجارت کی نگرانی غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔
- سمندر کے نزدیک شہر نہ بسائے جائیں۔
- خدائی وودیعت اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان لانا ہر شہری پر لازم ہے۔
- موجودہ مادی کائنات اپنی ہیت کے اعتبار سے حقیقی نہیں بلکہ اس حقیقی کائنات جو ماورائے کائنات میں حقیقت مطلقہ کی صورت میں موجود ہے کا عکس ہے۔
- بنیادی طور پر انسانی روح ایک ایسی خارجی قوت ہے جو عرش سے پھوٹ رہی ہوتی ہے جو اپنی فطرت میں لافانی ہے اور اس کا تعلق اس حقیقی کائنات سے ہے جو ہمارے حواس سے بالاتر کہیں اور موجود ہے۔
- انسانی ذہن اپنی فطرت میں روحانیت کا حامل ہے۔
- انسان روحانی لحاظ سے لافانی ہے اور اس لحاظ سے اس کا ذہن بھی لافانی ہے۔
- انسان اپنے ذہن میں موجود غیر تغیر پذیر اور لازوال تصورات کے ذریعے

ماورائے کائنات میں موجود حقیقت مطلق کی ہیت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

- ◎ کائنات اور اس کے مظاہر ایک با مقصد تخلیق ہے۔
- ◎ فطرت کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے۔
- ◎ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والا علم نا مکمل اور غیر یقینی ہوتا ہے۔
- ◎ حقیقی، مستند اور پائیدار علم صرف دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔
- ◎ انسانی عقل علم کے ذریعے معنی اور ترتیب تلاش کر کے موجودات کی نوعیت اور ان کی حقیقت کو خود پر عیاں کرتا ہے۔
- ◎ نیکی، بھلائی، سچائی اور خوبصورتی کی حیثیت و نوعیت غیر متغیر اور ابدی ہوتی ہے۔
- ◎ ایک مثالی زندگی ایک مثالی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔
- ◎ برائی نہ صرف پورے معاشرے کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اس سے کائنات کی ابدی روح کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔
- ◎ برائی ایک نا مکمل اچھائی اور کائنات کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا نتیجہ ہے۔
- ◎ حسن اپنی ہیت میں وسیع روحانی نظام کی فطرت کا عکس ہے۔
- ◎ نیکی یا فضیلت علم ہے اور بے علم وجدانی فیصلے بعض اوقات غلط ثابت ہوتے ہیں۔
- ◎ اچھائی وہ ہے جس پر صحیح عمل کا انحصار ہو جو دوسروں کو سکھائی جا سکتی ہو اور جو وجدانی نہ ہو۔
- ◎ تخلیق انسانی ذہن کا ایک اسلوب ہے۔

◎ تصور ہی حقیقت ہے۔

◎ مثالی مملکت کا حقیقی مقصد عدل یا انصاف ہے۔

◎ تعلیم کا مقصد خود آگاہی ہے اس لیے دوران تعلیم روح کی شکل پذیرائی کا اہتمام ضروری ہے۔

◎ اصل تعلیم 50 سال کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ اس عمر میں انسان کی عمر پختگی کے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

◎ تعلیم فرد کی روح اور ذہن کو جلا بخشتی ہے اور وہ خیر وشر' نیکی وبدی اور اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔

◎ مردوں اور عورتوں کے لیے تعلیم یکساں ہونی چاہیے۔

◎ موسیقی جس میں ادب اور فن بھی شامل ہے مملکت کے اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں ممدو معاون ثابت ہوتے ہیں۔

◎ موسیقی کا مقصد ذہن کی براہ راست تربیت کرنا' جذبات کی اصلاح کر کے متوازن بنانا اور قوت استدلال کو صورت اظہار بخشنا ہے۔

◎ موسیقی فرد کی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرواتی ہے جس کی بدولت انسان پیش آنے والے مسائل کو اپنی طرز پر حل کر سکتا ہے۔

◎ حواس خمسہ کے محسوسات یا حواس خمسہ کا عمل علم نہیں بلکہ یہ ایک دھوکا اور فریب ہے۔

◎ تصور حتمی اور آفاقی ہوتا ہے اور یہ کسی فرد کی ذاتی رائے یا تاثر کا تابع نہیں ہوتا۔

◎ تصور ایک معروضی حقیقت ہوتا ہے اور اس کا اپنا وجود اور اپنی حقیقت ہوتی ہے۔

◎ حواس خمسہ صرف انفرادی اشیاء کو محسوس کرواتے ہیں جبکہ ذہن اس چیز کا ایک عمومی آفاقی تصور پیش کرتا ہے۔

◎ ایک خیال یا تصور اپنی ذات میں مکمل چیز ہے اور خود اپنی وضاحت ہے۔

◎ خیالات کا جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود ہے۔

◎ حواس خمسہ کا جہاں ایک مکمل یا حتمی غیر حقیقت یا عدم وجود ہے۔

◎ خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

◎ فلسفہ خود ایک عظیم مقصد ہے۔ فلسفہ کسی شے کے لیے نہیں بلکہ سب چیزیں فلسفے کے لیے ہیں۔

◎ نیکی یا اخلاق بذات خود ایک مقصد ہے اور ان کا حصول انسانی زندگی کا نصب العین ہے۔

◎ دوسروں کو دیکھ کر نیکی کرنے والے نقال اور معمولی درجے کے ایماندار ہوتے ہیں۔

◎ اصل خوشی کسی کمزور اور مظلوم کی مدد کرنے اور حق بات کہنے سے حاصل ہوتی ہے چاہے اس کے لیے مال و جان کی قربانی دینی پڑے۔

◎ ایک فنکار یا ادیب اپنے فن یا ادب کو عقلی استدلال کے تحت تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ ایک وجدانی کیفیت میں سب کچھ کہتا ہے۔

◎ شاعری اور فنون لطیفہ جذبات کو برانگیختہ کرسکتے ہیں جس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

◎ شاعری اور فنون لطیفہ طبعی دنیا کی نقل ہے اور اس حساب سے وہ نقل کی نقل ہے اور اصلیت سے بہت زیادہ دور ہونے کے سبب اعتنا کے قابل نہیں۔

افلاطون کی موت

347ق م میں افلاطون اسی برس کا ہو گیا تھا۔ لکھنے لکھانے کا کام ختم ہو جانے کے
عث وہ اکثر اپنے شاگردوں میں گھرا رہتا۔ ایک دن وہ اپنے ایک شاگرد خاص کی شادی پر
مدعو تھا۔ نوجوان شاگرد شادی کی خوشیوں میں شریک تھے اور وہ ایک کونے میں کرسی پر
براجمان ان کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رات گئے شادی کا ہنگامہ ختم ہونے پر جب
شاگرد اپنے استاد کے پاس آئے تو وہ اپنے ہونٹوں پر ایک دائمی مسکان اور چہرے پر اک ابدی
سکون لیے گہری نیند سو رہا تھا اور اس کی روح جہان خیالات میں اپنے استاد سقراط کے پاس
جا چکی تھی۔ دوسرے روز لوگوں نے اس کی قبر پر یہ اقرار کیا کہ اس "عظیم فلسفی کی چھوڑی
ہوئی یادیں رہتی دنیا تک قائم رہیں گی"

افلاطون کی زندگی کے آخری ایام میں اکیڈیمی کی سربراہی کے لیے جھگڑا پیدا
ہوا۔ ارسطو کی خواہش تھی کہ وہ اپنے استاد کے بعد اس اکیڈیمی کا سربراہ بنے اور اپنے استاد
کے کام کو آگے بڑھائے لیکن افلاطون کی موت کے بعد اس کی خواہش اور وصیت کے مطابق
اس کا بھتیجا سپسی پس (Speusippus) جو ریاضیاتی اعداد کا قائل اور اکائی کو تکوینی عقل
اور خیر مطلق سے الگ تصور کرتا تھا اکیڈیمی کا سربراہ بنا جس پر ارسطو دل برداشتہ ہو کر
ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔

افلاطون کی وفات کے بعد اکیڈیمی کے جملہ اراکین میں سے اس کی وصیت

کے مطابق صدر کا انتخاب عمل میں لایا جاتا رہا۔یہ سلسلہ برس ہا برس تک چلتا رہا حتیٰ کہ 529ء میں شہنشاہ جسٹی نین نے اسے ختم کر دیا۔افلاطون نے ساری زندگی شادی نہیں کی بلکہ مرتے دم تک اس اکیڈمی میں درس و تدریس کے ذریعے ریاست کی تعمیر نو کے لیے نئی نسل تیار کرتا رہا۔زندگی کے آخری دور میں اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا اور اس کی قائم کردہ اکیڈمی ایک وقیع مجلس علم اور درسگاہ تسلیم کر لی گئی۔

تعارف

نام: ڈاکٹر شاہد مختار

تعلیم: ایم اے انگلش۔ ایم اے ہسٹری

ایم سی ایس۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی (امریکن ہسٹری)

ہماری دیگر مطبوعات

شاہد پبلشرز

چوبرجی سنٹر ملتان روڈ لاہور فون ۷۳۱۹۹۶۳

E-mail: shahidpublications@hotmail.com Web : www.shahidpublications.0catch..com